بیادگار: حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

خواتین کا ترجمان

ماہنامہ

رضوان

لکھنؤ

جلد نمبر ۶۳

شمارہ نمبر ۱۰

اکتوبر ۲۰۱۹ء

October 2019

سالانہ زرتعاون

برائے ہندوستان	:	۳۰۰/روپے
غیر ملکی ہوائی ڈاک	:	۴۰/امریکی ڈالر
فی شمارہ	:	۳۰/روپے
لائف ٹائم خریداری	:	۸۰۰۰/روپے

نوٹ

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر اور مکمل صاف پتہ ضرور لکھیں، اگر مدت خریداری کے ختم ہونے کے وقت کی پرچی پتہ کی چٹ پر لگی ہو تو براہ کرم مدت خریداری ختم ہوتے ہی رقم ارسال فرمائیں۔ (منیجر)

ایڈیٹر

محمد حمزہ حسنی

مجلس ادارت

میمونہ حسنی — عائشہ حسنی

جعفر مسعود حسنی — محمود حسن حسنی

ڈرافٹ پر RIZWAN MONTHLY لکھیں

زر تعاون اور خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ رضوان

۱۷۲/۵۴، محمد علی لین گوئن روڈ لکھنؤ

پن کوڈ: ۲۲۶۰۱۸ - موبائل: ۹۴۱۵۹۱۱۵۱۱

Rizwan (Monthly)

172/54, Mohammad Ali Lane

Gwynne Road Lucknow

Pin:226018- Mobile: 9415911511

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد حمزہ حسنی نے مولانا محمد ثانی حسنی فاؤنڈیشن کے لیے نظامی آفسیٹ پریس میں چھپوا کر دفتر رضوان محمد علی لین سے شائع کیا

کمپوزنگ: ناشر کمپیوٹر، لکھنؤ۔ فون: 9792913331

E-Mail : azizpaitepuri@gmail.com

فہرست مضامین

- اپنی بہنوں سے ..... مدیر 5
- حدیث کی روشنی میں ..... امۃ اللہ تسنیم 6
- موجودہ حالات اور جان و مال کا انشورنس ..... مولانا خالد سیف اللہ رحمانی 8
- موت: دائمی زندگی کی ابتداء ..... ابن بشیر 12
- دل کی تلاش ..... مولانا ڈاکٹر سعود عالم 14
- نماز اور کائناتی توانائی: نماز یوگا سے بہتر ہے ..... عائشہ محمد عابد ندوی (جدہ) 17
- اسلام میں ادائیگی حقوق کی اہمیت ..... مفتی عثمان الدین 21
- غزوات نبوی علی صاحبہا التحیۃ کا سن وار تذکرہ ..... مولانا محمد جہان یعقوب 23
- اسوۂ ہاجرہ: خواتین کیلئے مشعل راہ ..... مولانا محمد مجیب الدین قاسمی 28
- متکبر کون ہے؟ انجام کیا ہے؟ ..... مفتی مجیب الرحمٰن 32
- سکھ مت: ایک تعارف ..... مفتی تبریز عالم حلیمی قاسمی 34
- کالج یونیورسٹی طالبات کو بھٹکنے سے کیسے بچائیں ... عاصمہ شفیع 38
- سوال و جواب ..... مفتی راشد حسین ندوی 40
- آخری صفحہ ..... مولانا قمر الزماں ندوی 41-42

اپنی بہنوں سے

سرور کائنات حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت عین ایمان ہے، اس سے کسی بھی صاحب ایمان کو اختلاف نہیں، خود حضور اقدس فداہ ابی وامی کا ارشاد گرامی ہے۔

لا یومن احدکم حتیٰ اکون احب الیه من والده و ولده والناس اجمعین۔ تم میں سے کسی کا بھی اس وقت تک ایمان کامل نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو والد اور بیٹے اور سارے ہی لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ اس محبت وتعلق کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے جس طرح اپنے اندر پیدا کیا۔ ان کے واقعات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ ہر صحابی مرد اور ہر صحابیہ خاتون آپ کی محبت وتعلق سے سرشار تھیں آپ کے آگے محبوب سے محبوب شخص اور آپ کی چیز کے آگے محبوب سے محبوب چیز ہیچ تھی پھر صحابہ کرام کے بعد امت اسلامیہ کے سارے افراد نے اس تعلق کو قائم رکھا اور آپ پر قربان ہونے اور محبوب چیزوں کو نچھاور کرنے کے لئے ہر زمانے میں مسلمان ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور آج بھی آپ کی محبت ہماری قیمتی متاع اور قابل صد فخر سرمایہ ہے۔ اس گئے گزرے اور فتنوں سے بھرے غیر دینی ماحول میں گنہگار سے گنہگار مسلمان بھی وقت آنے پر اپنے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہونے کو تیار ہے لیکن صرف محبت اور وقت آنے پر قربانی کافی نہیں ہے محبت وہ ہے کہ محبوب کی ہر چیز محبوب ہو۔ اس کی ہر ادا واجب الاحترام ہو اس کا ہر فعل اور ہر دل وجان سے زیادہ عزیز ہو۔ یہی محبت کا تقاضا ہے اور یہی محبت کا ماحصل ہے۔ سب سے بڑی محبت یہ ہے کہ آپ کی اطاعت کی جائے اور آپ نے جن کاموں سے روکا ہے اس سے رکا جائے۔ صورت میں، سیرت میں، اخلاق میں، طرز زندگی میں، معاشرت میں، عبادت میں غرض کہ ہر ہر قول وفعل میں آپ کے ارشاد پر عمل کیا جائے اور آپ کی مشابہت اختیار کی جائے۔ بس یہی محبت ہے اور اسی پر جنت کی بشارت ملی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

میری امت کے سب لوگ جنت میں جائیں گے مگر وہ جنت سے محروم رہیں گے جنہوں نے انکار کیا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انکار کون کرے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔

ذوق رکھ سنت گرامی سے — ہے شرف آپؐ کی غلامی سے
جو کوئی پیرو رسول ﷺ نہیں — لاکھ طاعت کرے قبول نہیں

حدیث کی روشنی میں

غیبت کی حرمت اور زبان کی حفاظت کی تاکید

امۃ اللہ تسنیم

بات کہے تو بہتر کہے ورنہ خاموش رہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ بات کہے تو بہتر کہے ورنہ خاموش رہے۔ (بخاری، مسلم)

(اس حدیث سے صاف ظاہر ہوگیا کہ انسان کو اچھی بات کہنا چاہئے جس میں کوئی مصلحت ہو اور جس سے کوئی بھلائی ظاہر ہو اور جب بھلائی کے ظاہر ہونے میں کوئی شک ہو تو خاموشی بہتر ہے اس لئے کہ سلامتی صرف خاموشی میں ہے۔)

مسلمانوں میں افضل

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ مسلمانوں میں سب سے افضل کون ہے، آپ نے فرمایا جس مسلمان کی زبان اور بات کے شر سے لوگ محفوظ رہیں۔ (بخاری، مسلم)

دو چیزوں کی ضمانت

حضرت سہل رضی اللہ عنہ بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مجھ سے اس بات کا عہد کرلے کہ میں اپنی زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کروں گا اور اسے حرام سے بچاؤں گا تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرلیتا ہوں۔ (بخاری، مسلم)

بے خیالی کا کلمہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ کوئی بات کہتا ہے اور اس کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ اس بات کے ذریعہ وہ آگ میں مشرق و مغرب کی مسافت سے زیادہ گر جاتا ہے۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ بعض اوقات ایسی بات بول جاتا ہے جس سے اللہ کی رضا حاصل ہوجاتی ہے مگر اس کو اس کی اہمیت نہیں معلوم ہوتی، اس بات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اس کے درجوں کو بلند کردیتا ہے اور کوئی بندہ ایسی بات کہہ بیٹھتا ہے کہ جس کے کہنے سے اللہ تعالیٰ کا غصہ نازل ہوتا ہے، اس کو کچھ خبر نہیں، کوئی کھٹکا نہیں کہ اس کے سبب سے وہ آگ میں جارہا ہے۔ (بخاری)

حضرت عبدالرحمٰنؓ بلال بن حارث مزنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی کوئی بات ایسی کہتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے وہ نہیں سمجھتا کہ میری بات اس درجہ کی ہوگی کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشنودی (یعنی قیامت تک اس سے خوش ہی رہتا ہے) قیامت کے دن تک کے لئے لکھ لے گا اور آدمی بعض بات ایسی کہتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی ناراضی ثابت ہوتی ہے اور وہ خیال نہیں کرتا کہ یہ کلمہ ایسا برا ہے کہ برائی میں اس درجہ کو پہنچے گا اور اللہ تعالیٰ اس کلمہ کے سبب اپنی ناراضگی قیامت کے دن تک لکھ لے گا۔ (یعنی قیامت تک اس سے ناراض رہتا ہے)۔ (موطا و ترمذی)

مختصر بات

حضرت سفیانؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ مجھے ایسے کام کی بات بتایئے جس کو میں مضبوطی سے پکڑلوں۔ آپ نے فرمایا **قل ربی اللہ ثم**

استقم۔ کہو میرا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہو، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو میرے لئے سب سے زیادہ کس چیز کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا اس سے۔ (ترمذی)

(یہی چیز ہے جس سے اکثر گناہ سرزد ہوجاتے ہیں، حرام کھانے کا بھی اس سے ڈر ہے اور اللہ کی ناراض کے کلمہ بولنے کا بھی اس سے ڈر ہے۔)

بسیار گوئی

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اللہ کے ذکر کے سوا زیادہ بات نہ کیا کرو، زیادہ بولنا دل کو سخت کردیتا ہے اور سخت دل آدمی اللہ تعالیٰ سے بہت دور ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کی زبان اور شرمگاہ کو اللہ تعالیٰ نے شر سے بچالیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (ترمذی)

سلامتی کا راستہ

حضرت عقبہؓ بن عامر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ کس بات سے نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ آپ نے فرمایا اپنی زبان کو روکو۔ اور گھر تمہارے لئے کافی ہو اور اپنی خطاؤں پر رویا کرو۔ (ترمذی) (یعنی اپنی زبان کے شر سے لوگوں کو بچانے کے لئے گھر میں بیٹھ رہنا چاہئے)

زبان کی اہمیت

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر صبح کو انسان کے تمام اعضا زبان کے آگے عاجزی کرتے ہیں، کہتے ہیں خدا کے لئے ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر۔ اگر تو سیدھی ہے تو ہم بھی سیدھے رہیں گے، اگر تو ٹیڑھی ہے تو ہم بھی ٹیڑھے رہیں گے۔ (ترمذی)

ابواب خیر

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ مجھے ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت کا مستحق بنادے اور دوزخ سے محفوظ رکھے، آپ نے فرمایا تم نے بڑی اچھی بات پوچھی ہے یہ کام اللہ تعالیٰ جس پر آسان کردے تو آسان ہے۔ وہ کام یہ ہیں۔ تم اللہ کی عبادت کرو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور خانۂ کعبہ کی استطاعت ہو تو حج کرو۔ پھر فرمایا میں تم کو بھلائی کے دروازوں کی خبر دوں، سنو روزہ سپر ہے (یعنی یہ گناہ اور دوزخ سے بچاتا ہے) اور صدقہ گناہوں کو اس طرح بجھاتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھادیتا ہے اور آدھی رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا، (یعنی تہجد کی) پھر آپ نے یہ آیۃ شریفہ پڑھی۔

تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَطَمَعاً وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔

(الم سجدہ۔ ع-2)

ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں اور اپنے رب کو ڈر اور امیدواری سے پکارتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں تو کوئی نہیں جانتا، جو ان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی ہے ان اعمال کے بدلے میں جو وہ کرتے ہیں۔

زبان کی بدولت

پھر فرمایا میں تم کو دین کا سر اور اس کا ستون اور اس کے کوہان کی بلندی بتادوں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایئے۔ آپ نے فرمایا دین کا سر اسلام ہے کہ بغیر اسلام کے دین کا وجود نہیں، جس طرح بغیر سر کے بدن بیکار ہے، اور اس کا ستون نماز ہے اور اس کے کوہان کی بلندی جہاد ہے، پھر فرمایا کیا میں تم کو ان کی جڑ بتاؤں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور فرمایئے، آپ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر بتایا اس کو روکو، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہماری گفتگو کا بھی ہم پر مواخذہ ہوگا، فرمایا تیری ماں تجھ کو روئے، لوگ آگ میں چہروں کے بل اپنی زبان کی بدولت گرائے جائیں گے۔ (ترمذی)

○○○

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

موجودہ حالات اور جان ومال کا انشورنس

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جدید ٹیکنالوجی نے ڈھیر ساری سہولتیں فراہم کی ہیں، جو سفر مہینوں میں طے ہوتا تھا، وہ اب گھنٹوں میں طے ہوتا ہے، جس پیغام کو پہنچانے میں مدت درکار ہوئی تھی، اب لمحوں میں دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہنچ جاتا ہے، لیکن یہ ترقی جہاں آسانی فراہم کرتی ہے، وہیں خطرات کو بھی جنم دیتی ہے، پیدل چلنے کے مقابلہ میں سائیکل اور سائیکل کے مقابلہ میں موٹر سائیکل اور موٹر سائیکل کے مقابلہ میں ہوائی جہاز کا سفر نسبتاً پُرخطر ہوتا ہے، ان خطرات کا تقاضا ہوتا ہے کہ اگر آدمی ان سے بچ نہ سکتا ہو تو کم سے کم اس کی تلافی صورت ہو، اسی پس منظر میں موجودہ دور میں انشورنس کا نظام شروع ہوا، جس کا مقصد یہ ہے کہ جس نقصان کو دو چار افراد برداشت کرنے سے قاصر ہوں، اس کو اتنے افراد پر تقسیم کردیا جائے کہ وہ قابل برداشت ہوجائے، مثلاً ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ذریعہ کسی شخص کی موت ہوگئی اور اس کو پانچ لاکھ روپے ہرجانہ دینا پڑے تو بظاہر اس کے لئے اس بوجھ کو اُٹھانا دشوار ہوگا، لیکن فرض کیجئے کہ اس شہر میں ایک لاکھ ڈرائیور کام کرتے ہوں اور ان کے درمیان طے ہوجائے کہ ان میں سے کسی سے بھی ایکسیڈنٹ ہوجائے تو اس کا جرمانہ ادا کرنے کے لئے ہر شخص کو پانچ روپیہ ادا کرنا ہوگا تو یہ آسانی 5 لاکھ جمع ہوجائیں گے اور یہ چنداں دشوار نہیں ہوگا، یعنی ایک فرد پانچ لاکھ کا نقصان برداشت نہیں کرسکتا، لیکن ایک لاکھ افراد پانچ لاکھ کے نقصان کو بسہولت برداشت کرسکتے ہیں انشورنس میں بنیادی طور پر یہی کام کیا جاتا ہے، مثلاً ایک لاکھ ڈرائیور کمپنی کے ممبر ہوگئے، ان سب نے ایک متعینہ رقم جمع کی، پھر اس گروپ میں سے جو شخص ایسے حادثہ سے دوچار ہوتا ہے، کمپنی اس کی مدد کرتی ہے۔

غور کیا جائے تو اپنی اصل کے اعتبار سے یہ طریقۂ کار شریعت اسلامی سے ہم آہنگ ہے، اور اس کی مثال دیت یعنی خون بہا ہے، شریعت میں جتنے واجبات رکھے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مقدار دیت کی ہے، جو قاتل مقتول کے ورثہ کو ادا کرتا ہے، مگر شریعت نے تنہا قاتل پر اس کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے، بلکہ اس کے تمام رشتہ داروں کو اس میں شامل کیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں مزید وسعت پیدا فرمائی، اور اس کے طریقۂ کار سے استفادہ کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پیشہ سے جڑے ہوئے تمام لوگوں کو ان کا عاقلہ قرار دیا کہ یہ سب لوگ مل کر اپنے ہم پیشہ فرد کی دیت ادا کریں گے۔

اس پہلو سے غور کیجئے تو انشورنس کا نظام شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہے، چونکہ موجودہ دور میں پورا معاشی نظام یہودیوں کے ہاتھوں میں ہے اور حالانکہ تورات میں بھی سود کو منع کیا گیا ہے، لیکن یہود ونصاریٰ نے عملاً اس کو اپنے لئے حلال کرلیا ہے، اس لئے انہوں نے بینک اور انشورنس کے نظام کو سود سے آلودہ کررکھا ہے، اور انشورنس میں تو سود کے علاوہ قمار بھی شامل ہے، اس لئے اگرچہ علماء عرب میں سے مشہور حنفی فقیہ شیخ مصطفیٰ زرقائی، معروف محقق شیخ علی خفیف اور ہندوستان کے اہل علم میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے انشورنس کو تعاون کی ایک صورت قرار دیا ہے اور اس کے جواز کا حکم لگایا ہے،

مگر عالم اسلام اور برصغیر کے جمہور علماء نے سود اور قمار کی شکل پائی جانے کی وجہ سے اس کو ناجائز ہی قرار دیا ہے، اور یہی راجح ہے۔

لیکن ہندوستان میں اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی جان و مال پر منصوبہ بند حملے کئے جارہے ہیں، پولیس جس کا کام امن و امان کی حفاظت ہے، خود فرقہ پرستی میں مبتلا ہے، بعض جگہ خود پولیس بلوائیوں کے ساتھ شریک ہوجاتی ہے، جب مسلمان اپنا معاملہ لے کر جاتے ہیں تو ایف آئی آر درج کرنے پر بھی تیار نہیں ہوتی، اور اگر کیس لیتی ہے تو اتنی کمزور دفعات کے تحت جو عدالت میں چل نہیں سکتیں، اور اگر چل جائے تو معمولی سزا پاکر مجرم رہا ہوجائے، بعض دفعہ تو مظلوم کو ہی ظالم کے کٹہرے میں کھڑا کردیا جاتا ہے، آر ایس ایس نے اتنے بڑے پیمانہ پر ملک کی انتظامیہ میں اپنے لوگوں کو شامل کردیا ہے کہ قانون کی حفاظت کرنے والے خود قانون شکنی پر تلے ہوئے ہیں، اور اب تو حکومتیں بھی کھلے عام مفسدین کی پشت پناہی کررہی ہیں۔

یوں تو مسلمان 1947ء سے ہی اس صورت حال سے دوچار ہیں، اور راورکیلا، جمشید پور، بھاگلپور سے لے کر مرادآباد تک کتنے ہی مقتل سجائے جاچکے ہیں، لیکن گجرات میں نریندر مودی کے اقتدار کے بعد اس خوں آشامی کا ایک نیا دور شروع ہوا، 2002ء میں گجرات کا جو فساد ہوا وہ کوئی وقتی فساد نہیں تھا، بلکہ مسلمانوں کی منصوبہ بند نسل کشی تھی، پھر جب 2014ء میں مودی کو وزارت عظمیٰ کا تاج پہنایا گیا تو نفرت کی یہ لہر پورے ملک میں دوڑائی گئی، جب اپنے پانچ سالہ اقتدار میں وہ اپنا کوئی وعدہ پورا نہیں کرسکے تو خاص طور پر پوری قوت کے ساتھ نفرت کے ایجنڈے کو بڑھایا گیا، اور گھر گھر اسے پہنچایا گیا، اس کی وجہ سے ہجومی تشدد کی جو صورت حال پیش آرہی ہے، اور لوگوں سے ''جے شری رام، وندے ماترم اور بھارت ماتا کی جے'' جیسے نعروں کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اور اس کے پورا نہ کرنے پر لوگوں سے زندہ رہنے کا حق چھینا جارہا ہے، اس لئے مسلمان دین و ایمان کے ساتھ ساتھ جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے سلسلہ میں دشوار سے دشوار تر حالات سے دوچار ہیں۔

ان حالات میں سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان لائف انشورنس یا دکان اور کاروبار کا انشورنس کرسکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں اس بات کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ عوام کی جان و مال کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے، اگر حکومت اس ذمہ داری کو ادا نہیں کرتی تو وہ قصوروار ہے، اور خاص کر جب حکومت کے نمائندے خود کوتاہی میں مبتلا ہوں تو یہ ظلم بالائے ظلم ہے، دوسری طرف انشورنس بھی ایک سرکاری کمپنی ہے اور اصول ہے کہ اگر کسی شخص کا حق باقی ہو اور وہ حق ادا کرنے میں ٹال مٹول سے کام لے یا انکار کرے اور اس کی کوئی چیز صاحب حق کے قبضہ میں آجائے تو وہ اس سے اپنا حق وصول کرسکتا ہے، اس کو فقہ کی اصطلاح میں ''ظفر بالحق'' کہتے ہیں۔ پس ایسی صورت میں کہ حکومت جان و مال کا ہرجانہ ادا نہیں کرتی، کیا انشورنس سے ملنے والی رقم کو اپنے حق کی وصولی تصور کیا جاسکتا ہے؟ دوسرے: بعض دفعہ گھر کے ایسے مرد کو قتل کردیا جاتا ہے، جس پر گھر کی تمام ذمہ داریاں ہوتی ہیں، یا دکان اور کاروبار کو نذر آتش کردیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ سڑک پر آجاتا ہے، ایسے لوگوں کے لئے اس طرح کی اسکیمیں جو کسی درجہ میں نقصان کی تلافی کرسکیں، حاجت کا درجہ اختیار کرلیتی ہیں، اور ضرورت و حاجت کی وجہ سے حکم میں تخفیف ہوتی ہے، تیسرے: انشورنس کی رقم براہ راست نہ سہی، بالواسطہ حکومت ہی ادا کرتی ہے، اگر مظلوموں کو یہ رقم ادا کرنی پڑے تو شاید اس کی وجہ سے حکومت کو تنبیہ ہو اور وہ ایسے واقعات کو روکنے کے لئے چوکسی کا ثبوت دے، یہ مختلف پہلو ہیں، جن کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔

ان حالات میں ہندوستان کے بہت سے علماء اور ارباب افتاء نے گنجائش کا پہلو نکالا ہے، چنانچہ 1960ء کے بعد جب ملک بھر میں فسادات کی لہر چل رہی تھی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر ندوہ کے زیر انتظام مجلس تحقیقات شرعیہ نے 15/16 دسمبر 1965ء کو غور و فکر کے لئے ہندوستان کے

چند اہم علماء کو مدعو کیا، جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی، حضرت مولانا فخر الحسنؒ صاحب سابق صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدینؒ مفتاحی سابق مفتی دارالعلوم دیوبند وغیرہ شامل تھے، ان حضرات نے جو فیصلہ کیا وہ حسب ذیل ہے:

''مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے ''ربا وقمار'' لازم ہے، اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا بھی واجب ہے، لیکن جان و مال کے تحفظ و بقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے، مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے، نیز مجلس اس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کرسکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی: بلکہ بین الاقوامی سطح پر انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہوگیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر نہیں ہوتا، اس لئے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائداد کا بیمہ کرائے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے۔''

پھر ان ہی حالات کو دیکھتے ہوئے 1990ء میں ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند نے نہ صرف اس کے جواز کا فتویٰ صادر کیا، بلکہ مطبوعہ پمفلٹ کی شکل میں پورے ملک میں پہنچایا۔ اس پر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے مفتیان کرام اور متعدد اساتذہ کے بھی دستخط تھے، پھر 30 اکتوبر 1992ء کو اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے پانچویں سمینار منعقدہ اعظم گڑھ میں اسی نقطۂ نظر کو دہرایا، اس فیصلہ پر دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، امارت شرعیہ بہار اور جنوبی ہند کے ممتاز علماء نے دستخط کئے اور اپنا اتفاق کا اظہار کیا، جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

''مروجہ انشورنس اگرچہ شریعت میں ناجائز ہے: کیونکہ وہ ربو، قمار غرر جیسے شرعی طور پر ممنوع معاملات پر مشتمل ہے، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں جب کہ مسلمانوں کی جان و مال، صنعت وتجارت وغیرہ کو فسادات کی وجہ سے ہر آن شدید خطرہ لاحق رہتا ہے، اس کے پیش نظر **"الضرورات تبیح المحظورات"** رفع ضرر، دفع حرج اور تحفظ جان و مال کی شرعاً اہمیت کی بناء پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان و مال کا بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت ہے۔''

جہاں تک انفرادی فتاویٰ کی بات ہے تو علماء بریلی اور جنوبی ہند کے بعض بڑے دارالافتاء چونکہ ہندوستان کو دارالحرب مانتے ہیں اور وہ فقہ حنفی کے مشہور نقطۂ نظر کے مطابق ہندوستان میں سود کے تحقق ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور دھوکہ اور جبر کے بغیر تمام عقود فاسدہ کو درست قرار دیتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک یوں بھی انشورنس کرانا اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، لیکن جو حضرات ہندوستان میں سود اور قمار کو ناجائز کہتے ہیں، انہوں نے اپنے انفرادی فتاویٰ میں بھی ملک کے حالات کے پس منظر میں اس کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ ماضی قریب کے صاحب نظر مفتی حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''.....مگر سوال میں جن خطرات کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ بھی واقعہ ہیں اور بیمہ کرالینے کی صورت میں فسادیوں کی نظر بد سے دوکان وغیرہ کی بہ ظن غالب حفاظت ہوجاتی ہے، اس لئے قانون فقہ ''الضرر یزال'' کے پیش نظر خطرے کی چیزوں کا بیمہ کرالینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ بیمہ کمپنی میں جو رقم جمع کرائی ہے، اس سے زیادہ جو رقم ملے، وہ غرباء اور محتاجوں میں بلانیت ثواب تقسیم کردی جائے، اپنے کام میں ہرگز نہ لی جائے، ہاں، اگر خدانخواستہ خود ہی محتاج ہوجائے تو علماء کرام سے فتویٰ حاصل کرکے بقدر ضرورت اپنے استعمال میں لینے کی گنجائش ہے۔'' (فتاویٰ رحیمیہ: 231/6)

استاذ گرامی سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

''بیمہ میں سود بھی ہے اور جوا بھی، یہ

دونوں چیزیں شرعاً ممنوع ہیں، بیمہ بھی ممنوع ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہوکر بیمہ کرائے بغیر جان و مال کی حفاظت ہی نہ ہوسکتی ہو یا قانونی مجبوری ہوتو بیمہ کرانا درست ہے۔"

(فتاویٰ محمودیہ:24/454)

دارالعلوم دیوبند کے ایک اور سابق مفتی حضرت الاستاذ مولانا مفتی نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قانونی مجبوری یا ملکی فساد وغیرہ کے خطرے سے بچنے کی نیت سے انشورنس کرانے کی گنجائش ہے، باقی اپنے جمع کئے ہوئے روپے سے زائد جو روپیہ ملے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر گورنمنٹ کمپنی سے زائد رقم لے تو اس کو ایسے ٹیکس میں دینا درست ہے، جو براہ راست گورنمنٹ خزانے میں پہنچتا ہو، جیسا کہ (4) کے تحت لکھے ہوئے ضابطہ میں بتلادیا گیا ہے، اگر اس طرح کے ٹیکس میں نہ دینا ہو یا دینے سے بچ جائے تو پھر ایسی صورت میں اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے ثواب کی نیت کے بغیر غرباء ومساکین کو جلد سے جلد دے کر یا ایسے مدارس دینیہ میں دے کر جس میں غیر مستطیع طلبہ کو کھانا کپڑا دیا جاتا ہو، اپنی ملکیت سے نکال دیں، اور ان مدارس میں دیتے وقت ان کے مصارف میں صرف کرنے کی تاکید کردیں، بلکہ اگر اپنے یہاں ایسے دینی مدارس موجود نہ ہو اور ان مدارس کی ضرورت ہو تو ایسے مدارس قائم کرکے غریب بچوں کو اس میں کھانا کپڑا وغیرہ دینے کا نظم کرکے اس میں بغیر نیت ثواب دے دینا چاہئے کہ اس سے دین اور علم دین کو فروغ اور ترقی ہوگی اور اس فروغ اور ترقی کا ثواب خود بخود ملے گا۔" (منتخبات نظام الفتاویٰ:3/10099)

لہٰذا اس وقت ملک کی جو صورت حال ہے، اس میں شریعت کے احکام ومصالح اور مسلمانوں کے ساتھ کئے جانے والے مظالم کے پس منظر میں جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

(1) زندگی اور املاک کا انشورنس اصلاً جائز نہیں ہے: اس لئے عمومی طور پر مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

(2) جن علاقوں میں مسلمانوں کے جان و مال کو خطرہ درپیش ہو اور وہاں بار بار فسادات کی نوبت آتی ہو، وہاں بھی ایسے اہل ثروت کے لئے انشورنس جائز نہیں ہے، جو اس نوع کے مالی نقصانات کو برداشت کرسکتے ہوں، اور جن کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ جانی و مالی نقصان کی وجہ سے وقتی طور پر سہی، بحالت موجودہ ان کے لوگ بے سہارا ہوجائیں گے۔

(3) جو لوگ ایسی محفوظ آبادیوں میں رہتے ہوں یا ایسے علاقوں میں ان کی دوکانیں ہوں کہ وہ جانی و مالی خطرات سے دوچار نہ ہوں تو ان کے لئے بھی انشورنس سے اجتناب ضروری ہے۔

(4) جو مسلمان غریب ہوں، ایسی آبادیوں میں رہتے ہوں، یا ایسی آبادیوں سے بار بار گزرنے کی نوبت آتی ہو، جس میں جان و مال کو خطرہ ہو، یا ایسے ہی غیر محفوظ علاقہ میں ان کی تجارت اور کاروبار ہوتو ان کے لئے جان و مال کے انشورنس کی گنجائش ہے۔

(5) جان و مال کا انشورنس کرانے کی صورت بیمہ کرانے والے کے لئے اس کی اصل رقم ہی جائز ہوگی، ملنے والی زائد رقم جائز نہیں ہوگی، اور ضروری ہوگا کہ بغیر نیت ثواب غرباء پر صدقہ کردے یا یہ رقم رفاہی کاموں میں خرچ کردی جائے، لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب موت طبعی طور پر ہوئی ہو، یا کاروبار کسی آفت سماوی کا شکار ہوا ہو، اگر فسادات میں ہلاکت واقع ہوئی، یا کاروبار متاثر ہوا تو اب پوری رقم جائز ہوگی، اس لئے کہ انشورنس کمپنی نیم سرکاری کمپنی ہے، اور مسلمانوں کا تحفظ بھی سرکاری ذمہ داری ہے، حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی حفاظت میں غفلت، بلکہ ان کو نقصان پہنچانی کی سعی میں شرکت شب و روز کا مشاہدہ ہے، اس لئے یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تغافل کا ہرجانہ ادا کرے۔

ان امور کی رعایت کے ساتھ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے انشورنس کی گنجائش نکلتی ہے، اور اگر کوئی دوسرے غریب شخص کا انشورنس کرادے تو اس میں فقہی نقطۂ نظر سے قباحت مزید کم ہوجاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

○○○

ابن بشیر

موت: دائمی زندگی کی ابتداء

زندگی کب اور کیسے ختم ہوگی کوئی نہیں جانتا۔ انسان دنیا میں اسی لئے زندگی بسر کررہا ہے کیونکہ اس کو مرنا ہے۔ انسان کی عمر چاہے پچاس ہو، ساٹھ سال ہو، سو سال ہو یا زندگی کے کچھ لمحات میسر ہوں آخر اسے اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ایک نفس کو دنیا سے رخصت ہونا ہے اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ یہاں تک کہ فرشتوں کی روح بھی قبض کی جائے گی اور آخر میں حضرت عزرائیل علیہ السلام کو بھی موت کا مزا چکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لئے موت کا وقت مقرر کیا ہے موت سے نہ کوئی بھاگ سکتا ہے اور نہ کوئی بچ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کہہ دو جس موت سے تم بھاگ رہے ہو وہ تمہیں لاحق ہوکر رہے گی پھر تم حاضر و غائب کو جاننے والے کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔ پس وہ تم کو خبر کرے گا تمہارے اعمال کی۔" (الجمعہ)

سچ ہے کہ موت سے بھاگا اور موت میں گرا۔ کہاوت ہے کہ جو بچنے والا ہوتا ہے اسے سمندر میں بھی راستہ مل جاتا ہے اور جب قضا آجائے تو کوئی بھی چیز موت کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ بات اپنے دماغ میں پیوست کرلو کہ موت کبھی بھی آسکتی ہے۔ موت کا کوئی وقت نہیں۔ موت بول کر نہیں آتی۔ موت کے آنے کی کوئی نشانی نہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ پہلے ہم بوڑھے ہوں گے پھر بیمار اور پھر موت آجائے گی، نہیں ہرگز نہیں! موت بچپن میں بھی آسکتی ہے، موت جوانی میں بھی آسکتی ہے اور موت بوڑھاپے میں بھی آسکتی ہے۔ موت اس وقت بھی آسکتی ہے جب ہم صحت یاب ہوں۔ موت خلوت میں بھی آسکتی ہے اور دن کے اجالے میں بھی۔ صبح ہو یا شام ہر وقت ہم موت کی طرف گامزن ہے۔

الغرض موت کبھی بھی کسی بھی وقت آسکتی ہے اور ہمیں اس موت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ شیخ علی طنطاوی نے اپنے سماعات و مشاہدات میں لکھا ہے کہ شام کے ایک آدمی کے پاس لاری تھی۔ اس کے ساتھ ایک آدمی گاڑی پر سوار ہوا۔ اس کے اوپر حصہ میں ایمبولینس تھی جس میں ضرورت کے لئے ایک بادبان بھی تھا۔ بارش ہوگئی پانی بہا، یہ سوار کھڑا ہوا اور ایمبولینس میں داخل ہوگیا اور اپنے کو بادبان سے ڈھک لیا۔ اتنے میں ایک اور سوار ہوا جو ایمبولینس کی جانب چلا گیا، اسے معلوم نہ تھا کہ پہلے سے بھی کوئی آدمی موجود ہے۔ بارش پڑتی رہی، اچانک پہلے والے نے یہ دیکھنے کے لئے کہ بارش تھمی یا نہیں اپنا ہاتھ باہر نکالا؟ دوسرا بے چارہ اس کے چمکتے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر سمجھا کہ مردہ زندہ ہوگیا، اس پر گھبراہٹ اور خوف طاری ہوگیا۔ اپنے آپ کو بھول گیا اور شدید گھبراہٹ میں گاڑی سے نیچے گر پڑا جو اس کے بھیجا کو پاش پاش کرگئی۔ اس بے چارے کی موت اس طریقہ پر لکھی تھی وہ آکر رہی۔ صبح ہوئی تو شام کا انتظار نہ کریں اور شام ہوئی تو صبح کا انتظار نہ کریں۔

بس آج اور ابھی پر نظر رکھیں۔ نہ کل پر، جو اچھا برا گزر چکا اور نہ آئندہ پر جو ابھی آیا ہی نہیں۔ میں بس آج ہی زندہ رہوں گا، آج میری موت کا دن ہے یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے پھر آپ موت کے لئے سامان تیار کروگے۔ پھر اپنے آپ کو ہر لغزش سے دور رکھوگے، نیک کام انجام دوگے، نماز پڑھوگے، قرآن کی تلاوت کروگے، ماں باپ کی خدمت کروگے، ہمسائیوں کا حق ادا کروگے، صدقہ کروگے، اللہ کا خوف دل میں رکھوگے۔ الغرض آپ موت کو کثرت سے یاد کروگے اور اپنی اصلی زندگی کے لئے بہترین زادراہ تیار کروگے۔ جس سے آپ کی اصل زندگی کی ابتداء ہوگی۔ اور اگر آپ اپنی موت

کو بھول گئے۔ اس بات کو ذہن سے نکالا کہ مجھ کو کبھی موت کا مزا چکھنا ہے تو ظاہری بات ہے آپ کے دل سے اللہ کا خوف ختم ہوگا آپ کے دل کو زنگ لگ جائے گا اور ان سب کاموں سے دور رہو گے جس سے ہماری اصل زندگی (یعنی آخرت) اچھی بنے گی اور پھر جب موت آجائے گی پھر اپنے آپ پر پچھتاوا کرو گے کہ میں نے اپنی قیمتی زندگی کہاں گزاری۔

اس وقت کو غنیمت جانو کیونکہ اس وقت آب حیات ہو۔ جب موت آپ کے دروازے پر ہوگی تو پھر اللہ سے وقت کی درخواست مانگو گے مگر وقت نہیں ملے گا، آپ توبہ کرو گے مگر اس کی گنجائش نہ ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''دنیا میں اس طرح رہو، جیسے تم ایک (راہ چلتے) مسافر ہو یا کسی منزل کے راہی۔'' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''جب شام ہوجائے تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح ہوجائے تو شام کا انتظار نہ کرو اور بیماری سے پہلے صحت کو غنیمت سمجھو اور موت سے پہلے زندگی کو غنیمت سمجھو۔'' (بخاری: 6414)

''اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انسان کو جو لمحات میسر آئے ہیں انہی لمحات میں وہ موت کے بعد کے لئے زادراہ تیار کرتا ہے اور جب موت لاحق ہوجاتی ہے تو پھر یہ لمحات ختم ہوجاتے ہیں اور کوئی نیک عمل نہیں کیا جاسکتا۔ ایک انسان جب ان لمحات کو ضائع کرتا ہے تو موت کے وقت وہ نادم و پشیمان ہوجاتا ہے اور مزید مہلت کی درخواست کرتا ہے۔''

(مجموعہ احادیث: پانچ باتیں، مجاہد شبیر احمد فلاحی)

ہم نے کتابوں سے پڑھا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی طاقتور لوگ آئے ہر ایک نے موت کا مزا چکھ لیا۔

دوسروں کو موت کی دھمکی دینے والے خود موت کی آغوش میں چلے گئے۔ بڑی بڑی گاڑیوں میں سفر کرنے والوں نے بھی موت کا مزا چکھ لیا، اونچے اونچے مکانات میں رہنے والوں نے بھی موت کا مزا چکھ لیا، امیر ہو یا غریب، کمزور ہو یا طاقتور، چھوٹا ہو یا بڑا، کافر ہو یا مسلمان ہر ایک کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے: ہر ایک نفس کو موت کا مزا چکھنا ہے۔ (القرآن) اب ذرا اپنے آپ پر نظر ڈالیں کہ ہم نے موت کے لئے کیا سامان تیار کیا ہے۔ دنیاوی زندگی گزارنے کے لئے ہم نے رات دن کو ایک کیا، بڑے بڑے مکانات بنائے، اعلیٰ تعلیم حاصل کی، الغرض اپنی دنیاوی زندگی کو آرام دینے کے لئے ہم نے بہت محنت و مشقت کی جو کہ ایک ضرورت بھی ہے مگر یہ ہم اس زندگی کے لئے کر رہے ہیں جو کہ عارضی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ اس عارضی زندگی میں ہم نے ابدی زندگی (موت کے بعد کی زندگی) کے لئے کیا زادراہ تیار کیا ہے۔ کیا ہم نے اتنا سامان تیار کیا ہے جو ہماری قبر کو روشنی دے؟ کیا اتنا سامان تیار کیا ہے جو ہمیں جنت کی طرف لے جائے؟ کیا اتنا سامان تیار کیا ہے جس سے اللہ ہم سے راضی ہو؟

اپنے آپ کا احتساب کریں اور دیکھیں ہم کہاں ہیں۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر زندگی گزاریں۔ اسی میں ہماری فلاح ہے۔

○○○

بقیہ..... متکبر کون ہے؟ انجام کیا ہے؟

علامہ اقبال کا یہ فرمان سچ ہے:

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

بندہ جب خودرائی، خودنگری، خودفریبی اور عُجب نفس میں مبتلا ہوتا ہے تو خود کو بڑا سمجھنے لگتا ہے اور دوسروں کو اپنے مقابلے میں حقیر جاننے لگتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا، ایک شخص نے عرض کی: (یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) انسان چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو، جوتے اچھے ہوں، (کیا یہ تکبر ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (نہیں)، بے شک اللہ تعالیٰ (اپنی ذات، صفات اور افعال میں) جمیل ہے اور اپنی صفت جمال کا ظہور (اپنی مخلوق میں بھی) پسند فرماتا ہے، تکبر تو حق کے انکار اور لوگوں کو (اپنے مقابلے میں) حقیر جاننے کا نام ہے۔ (مسلم: 147)

○○

مولانا ڈاکٹر سعود عالم

دل کی تلاش

حضرت لقمان حکیم مشہور بزرگ اور حکمت و دانائی کے حامل انسان تھے، ان کا تذکرہ قرآن کریم میں موجود ہے بلکہ ایک سورۃ ان ہی کے نام سے موسوم ہے، اس لئے بعض لوگ ان کو پیغمبر بھی سمجھتے ہیں۔ ان کے متعلق تاریخ کی بعض کتابوں میں آتا ہے کہ وہ حبشی غلام تھے۔

ایک مرتبہ ان کے آقا نے حکم دیا کہ میرے لئے ایک بکرا ذبح کرو اور دو پاکیزہ بوٹیاں نکال کر پیش کرو۔ لقمان نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بکرا ذبح کیا اور زبان و دل نکال کر پیش کر دیا، ایک مرتبہ پھر آقا نے حکم دیا کہ بکرا ذبح کرو اور بدترین بوٹیاں نکال کر دکھاؤ۔ چنانچہ لقمان نے دوسری مرتبہ بکرا ذبح کیا اور پھر زبان و دل نکال کر پیش کر دیا۔ آقا نے حیرت سے پوچھا میں نے تم سے دو پاکیزہ بوٹیاں نکالنے کو کہا تو تم نے زبان و دل نکال کر پیش کر دیا اور جب میں نے بدترین بوٹیاں نکالنے کو کہا تو تم نے پھر وہی زبان و دل نکال کر پیش کر دیا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ لقمان نے جواب دیا ''زبان و دل اگر پاک ہوں تو ان سے زیادہ پاکیزہ کوئی چیز نہیں اور جب یہ دونوں ناپاک ہو جائیں تو ان سے بدتر کوئی چیز نہیں۔''

(تفسیر ابن کثیر۔ ج:3، ص:344)

زبان و دل انسانی وجود کا محصل اور ترجمان ہیں ایک شاعر نے اس کو بڑے خوصورت پیرایہ میں بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

لسان الفتی نصف و نصف فوادہ
و لم یبق الا صورۃ اللحم و الدم

انسان کا آدھا وجود اس کا دل اور آدھا وجود زبان ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ گوشت اور خون کی صورت ہے۔ زبان و دل کی پاکیزگی پر ہی ایمان کی سلامتی کا انحصار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کسی شخص کا ایمان درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کا دل درست نہ ہو اور کسی شخص کا دل درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو۔ (مسند احمد)

زبان و دل میں بھی مرکزیت دل کو حاصل ہے، کیونکہ یہی تمام احساسات، وجدان، ضمیر، جذب و کیف، وارفتگی اور آشفتگی کا سرچشمہ ہے، یہ صرف خون ہی کی گردش نہیں کرتا بلکہ افکار و اعمال میں ربط باہم کا ذریعہ ہے۔ اس کی پاکیزگی میں پورے وجود کی پاکیزگی مضمر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

سنو! جسم میں ایک بوٹی ایسی ہے کہ اگر وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جائے گا۔ آگاہ رہو کہ وہ دل ہے۔ (مسلم)

یہ دل پورے جسم و جان کا حکمراں ہے، اس کی حیثیت بادشاہ کی ہے وہ ظاہر و باطن سب پر اثر انداز ہوتا ہے، کوئی شخص کسی کام کے لئے آپ کو کتنا ہی اکسائے مگر آپ کا دل آمادہ نہ ہو تو وہ کام انجام نہیں پاسکتا اور دل مطمئن ہو جائے تو ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔ اعضاء و جوارح سب اس کی آمادگی کے ساتھ ہی حرکت کرنے لگتے ہیں۔ امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں: ''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جسم میں قلب کا مقام امام الناس کا ہے جس کی اطاعت لوگوں پر واجب ہے دیکھو کس طرح جسم کے تمام اعضاء دل کے غلام اور ترجمان ہیں اور اس کا حکم بجالاتے ہیں۔''

آنکھ سے دیکھنا بصارت ہے اور دل سے دیکھنا بصیرت ہے۔ بصیرت نہ ہو تو بصارت کا کوئی فائدہ نہیں، آدمی دل کی نگاہ

سے نہ دیکھے تو آنکھ رکھتے ہوئے بھی اندھا ہوجائے گا قرآن کہتا ہے:

آنکھیں اندھی نہیں ہوتی سینوں میں دل اندھے ہوجاتے ہیں۔(الحج-64)

اس لئے دل کی حفاظت کرنا اسے تابندہ رکھنا اور اس کا تزکیہ کرنا انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے ملتوں کے مرض کہن کا چارہ

بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دل چار قسم کے ہوتے ہیں:

(1) قلب اجرد۔صاف دل جیسے اس میں چراغ روشن ہے۔
(2) قلب اغلف۔غلاف میں لپٹا ہوا دل۔
(3) قلب منکوث۔شکستہ دل۔
(4) قلب مصفح۔زنگ آلود دل۔

قلب اجرد مومن کا دل ہے جس کا چراغ ایمان ہے۔قلب اغلف کافر کا دل ہے، قلب منکوث منافق کا دل ہے جو جان بوجھ کر حق کا منکر ہوجاتا ہے، اور قلب مصفح وہ دل ہے جس میں ایمان اور نفاق دونوں جمع کر لئے جاتے ہیں۔اس میں ایمان کی مثال سبزیوں کی ہے جس کو پاک اور صاف پانی نشو ونما دیتا ہے اور نفاق کی مثال ناسور کی ہے جس کو خون اور پیپ بڑھاتا رہتا ہے، ان دونوں میں جس کی مدت بڑھ جاتی ہے وہ دوسرے پر غالب آجاتا ہے۔(مسند احمد)

اس حدیث میں وضاحت سے دل کی ایمانی کیفیت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔مومن کے دل کو اجرد اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ہر قسم کی نجاست اور گندگی سے پاک ہوتا ہے، آئینہ کی طرح صاف ہوتا ہے۔اگر اس پر کوئی غبار آجائے تو مومن فوراً اس کو صاف کرنے کی فکر کرتا ہے، یہی دل انسان کی پاکیزہ زندگی کا ضامن ہے، اور اسی دل کو عطا کرنے کی دعا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خدا سے کی تھی جس کا تذکرہ عہد نامہ قدیم میں اس طرح آیا ہے:

''خداوند رات کے وقت سلیمانؑ کو خواب میں دکھائی دیا، خداوند نے کہا مانگ تجھے کیا دوں؟ تو سلیمان نے کہا تو اپنے خادم کو سمجھنے والا دل عنایت کر، اور یہ بات خداوند کو پسند آئی کہ سلیمان نے یہ چیز مانگی، اور خداوند نے اس سے کہا۔ چونکہ یہ چیز (دل) مانگی اور اپنے لئے درازی عمر کی درخواست نہ کی اور نہ اپنے لئے دولت کا سوال کیا اور نہ اپنے دشمن کی جان مانگی، بلکہ انصاف پسندی کے لئے تو نے اپنے واسطے عقلمندی کی درخواست کی ہے سو دیکھ میں نے تیری درخواست کے مطابق کیا کیا؟ میں نے ایک عاقل اور سمجھنے والا دل تجھے عطا کیا۔''(سلاطین:3/10)

علامہ رومیؒ نے ایسے ہی دل کی طلب اور تڑپ رکھنے کا مشورہ دیا ہے وہ کہتے ہیں:

طالب دل باش تاباشی چو مل
تاشوی شادماں و خنداں ہم چو گل

''دل کے طلبگار رہو تاکہ شراب کی طرح تازہ اور پھولوں کی طرح خوش وخرم رہو۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اپنے دل کو تین مواقع پر تلاش کیا کرو۔ (1) قرآن کریم سننے کے وقت۔ (2) ذکر کی مجلسوں میں۔ (3) تنہائی کے اوقات میں۔

اگر تم ان مواقع پر اپنے دل کو حاضر نہ پاؤ تو اللہ سے دعا کرو کہ وہ تمہیں ایک دل عطا کر کے احسان کرے۔(ابن کثیر)

قرآن سنتے وقت دل میں آمادگی کا ہونا خوف وخشیت کا پایا جانا زندہ دل کی علامت ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء باہم مشابہ اور جس میں مضامین بار بار دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں۔ پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہوکر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہوجاتے ہیں۔(الزمر)

ذکر کی مجلسوں میں دل کا حاضر رہنا زندہ دل کی علامت ہے، کیونکہ ذکر دل کی غذا ہے، اللہ کے ذکر سے دل میں قوت اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ارشاد ہے: اہل ایمان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے

ہیں۔ آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دل کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ (الرعد:82)

انسان کا دل اگر فولاد ہے تو اللہ کی یاد مقناطیس ہے اور مقناطیس فولاد کو اپنی طرف کھینچتا ہے اگر دل میں اللہ سے تعلق اور کشش نہ ہو تو وہ دل نہیں ہے۔ حضرت امیر خسرو کا شعر ہے:

ہر دل بے عشق را من دل نہ گفتم
تن بے سوز را جز گل نہ گفتم

جس دل میں عشق نہ ہو اسے میں دل نہیں کہتا اور جس بدن میں سوز نہ ہو اسے مٹی کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا۔

خلوت اور تنہائی میں دل کو تلاش کرنا زندہ دل کی تیسری علامت ہے۔ آدمی جب تنہا ہوتا ہے تو سکون و چین کا عالم ہوتا ہے اس وقت اس کے مرکز خیال اور کعبۂ دل میں اگر کوئی چیز رچی بسی ہو تو وہ خیر اور بھلائی ہو خود احتسابی ہو اور خدا ترسی ہو۔

حدیث میں جن سات آدمیوں کو قیامت کے دن عرش الٰہی کے سایہ میں جگہ ملنے کی بشارت دی گئی ہے ان میں ایک وہ شخص ہے جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کے آنسو بہہ پڑے (**رجل ذکر اللہ خالیا فاضت عیناہ**)۔ (مسلم)

رات کا وقت تنہائی اور سکون کا ہوتا ہے، ہر طرف سناٹا ہوتا ہے، ساری دنیا محو خواب ہوتی ہے ایسے میں کوئی بندہ اٹھتا ہے اور اللہ کے حضور پہنچتا ہے، اسے یاد کرتا ہے اس سے ہم کلام ہوتا ہے، اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھتا ہے، قلب بے قرار ہوتا ہے، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں، شان کریمی ایسے ہی لمحوں کے انتظار میں رہتی ہے۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے میرے اشک انفعال کے

قرآن میں جنتی بندوں کی علامت یہ بیان کی گئی ہے:

وہ لوگ قیامت کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے، راتوں کو کم ہی سوتے تھے، اور رات کے پچھلے پہروں میں استغفار کرتے تھے۔ (الزاریات:16-81)

تزکیہ وسلوک کا معاملہ یہ ہے کہ جب بندہ اللہ سے تعلق قائم کرتا ہے اور اس کی طرف یکسو ہونے لگتا ہے تو اس کے دل پر کچھ احوال اور کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ ایسے حالات میں قوت قلب یہ ہے کہ احوال قلب کو سنت و شریعت کے تابع رکھا جائے اور ضعف قلب یہ ہے کہ ان احوال کو غلبہ کا موقع دے دیا جائے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ تو کہتے ہیں کہ:

بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مومن کے دل کے پاس پاسبان شریعت بھی رہے تو باعث خیر ہے۔

○○○

मजलिस तहक़ीक़ात व नशरियाते इस्लाम की हिन्दी पुस्तकें

किताब का नाम	लेखक	मूल्य
मन्सबे पैग़म्बरी	मो0 सै0 अबुल हसन अली हसनी नदवी	100.00
नबियों के क़िस्से 1,2	"	120.00
नबी–ए–रहमत	"	250.00
दस्तूरे हयात (जीवन का पथ–प्रदर्शक)	"	70.00
सभ्यता और संस्कृति पर इस्लाम की	"	70.00
भारतीय मुसलमान एक दृष्टि में	"	80.00
मदीने की डगर	"	70.00
मानवता का संदेश	"	50.00
मानवता का स्तर	"	50.00
अच्छे–अच्छे नाम अल्लाह के	"	25.00
इस्लाम एक परिचय	"	40.00
इस्लाम क्या है?	मौलाना मनज़ूर नोमानी	60.00
आदर्श शासक	मौलाना अब्दुस्सलाम किदवाई नदवी	35.00
तूफ़ान से साहिल तक	मो0 असद	50.00
मुहम्मद सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम	मौलाना सैय्यद मो0 राबे हसनी नदवी	250.00
तोहफ़–ए–रमज़ान	"	40.00
हमारे हुज़ूर	अमतुल्लाह तसनीम	20.00
इस्लाम और इस्लामी	मौलाना इलियास नदवी भटकली	35.00
सीरत सुलतान टीपू शहीद	"	220.00
	Total	1635.00
	Rate After Disc & Including Postal Charges	1000.00

Ph.: 0522-2741539, A/c : 10863759700, SBI Main Br. Lucknow, IFSC : SBIN0000125

عائشہ محمد عابد ندوی (جدہ)

نماز اور کائناتی توانائی

نماز یوگا سے بہتر ہے

یہاں نماز کے وہ فائدے بیان کئے جارہے ہیں، جو مختلف طبی یا سائنسی تحقیقات کے بعد سامنے آئے ہیں:

☆.....نماز کے دوران یکسوئی کے ساتھ کھڑا ہونا، پیر، پنجوں، پنڈلیوں اور کمر کے درد سے آرام دیتا ہے۔

☆.....رکوع میں گھٹنوں کو پکڑنے سے کلائیوں اور کندھوں اور کمر کی ہڈیوں میں لچک پیدا ہوتی ہے، اور درد یا کوئی شکایت ہو تو اس میں افاقہ ہوجاتا ہے۔

☆..... پیشانی کو زمین پر جھکادینے سے خون کا دوران سر اور چہرے کی طرف تیز ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے چہرے کی تمام بیماریوں (کیل مہاسے، جھائیاں، پھنسی، خشکی، عورتوں کے چہرے کے غیر ضروری بال وغیرہ) سمیت فالج کا خطرہ کم ہوجاتا ہے۔

☆.....یونیورسٹی آف ملائشیاء میں سجدہ کی حالت میں ہونے سے ملنے والے فوائد پر بار بار تحقیق کی گئی، اور ہر بار یہی نتیجہ نکلا کہ سجدہ کی حالت میں انسان کے اندر توانائی کی ایسی لہریں، یا ایسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، جو سکون، اطمینان، اور خوشی کے جذبات پیدا کرتی ہیں، اور روزمرہ کی زندگی میں آنے والی مشکلات اور مصائب سے مقابلہ کرنے کی ہمت دیتی ہیں، ساتھ ہی انسان کی دماغی صلاحیتوں کو نکھارنے میں مدد دیتی ہیں بلکہ ماہرین کی رائے یہ ٹھہری کہ دماغی اور نفسیاتی مریضوں کے علاج پر مہنگی ادویہ اور کثیر رقم خرچ کرنے کے بجائے انہیں طویل ترین سجدہ کرائے جائیں۔

☆.....قعدہ کی حالت، مراقبہ کی مخصوص حالت ہے، جس میں انسانی دماغ سکون اور اطمینان حاصل کرتا ہے، اس کے علاوہ سجدہ میں جانے پھر اٹھنے، پھر آرام سے بیٹھنے، اور پھر دوبارہ سجدہ میں جانے سے کمر، کلائیوں اور گھٹنوں کی ورزش ہوجاتی ہے۔

☆..... سلام پھیرتے ہوئے گردن کو دائیں اور بائیں گھمانے سے سروائیکل انرجی کی دوران بہتر ہوجاتی ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ یوگا کے ماہرین خود مانتے ہیں کہ اس طرح گردن کو گھمانے سے گردن کی مہرے مضبوط ہوتی ہیں، اور وہاں سے خون کی دوران بہتر ہوجاتی ہے۔

☆.....طبی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ فجر کی نماز اپنی افادیت میں سب سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ کیونکہ صبح کے وقت کی تازی اور خوشگوار ہوا انسانی جسم کے لئے بیحد مفید ہے۔ اس ہوا سے انسانی جسم کے اعصاب قوی ہوتے ہیں، نیز یہ تازہ ہوا جسم کے اندر کے سبھی نظاموں کو درست کرتی ہے، یعنی ان کی گندگی کو (مردہ جراثیم اور زہریلے مادّوں کو) دور کرکے ان کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ طبی نتائج سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ صبح کی ہوا انسان کے اندر پھرتی پیدا کرتی ہے، مزید یہ کہ اس کی اختراعی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ طبیبوں اور ماہرین کا خیال ہے کہ صبح کے وقت کی ہوا کے جو فوائد ہیں، وہ بڑی سے بڑی خطیر رقم خرچ کرکے بھی حاصل نہیں کئے جاسکتے ہیں۔ اچھا..... پھر بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی ہے، تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے، جو لوگ صبح بیدار ہوکر پھر سوجاتے ہیں، ان میں بیمار ہونے کی شرح بڑھ جاتی ہے، ان کے جسم کا دفاعی نظام

سست ہوجاتا ہے، اور ان میں دل کی بیماریوں کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ نیز ایسے لوگ اپنی دیگر سرگرمیوں میں بھی بیحد ماند (کمزور) دیکھے گئے ہیں۔

کائناتی توانائی کے فوائد:

کائناتی توانائی کے بارے میں ہم یہ تو بتا چکے ہیں کہ یہ کسی نہ کسی درجہ میں ہر جاندار کے اندر موجود رہتی ہے، بلکہ زندہ رہنے کے لئے یہ توانائی اس قدر ضروری ہے کہ اگر لمحہ بھر کے لئے بھی اس توانائی کی ترسیل (سپلائی) روک دی جائے تو فوراً موت واقع ہوجاتی ہے۔

موجودہ دور کی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ انسان کے اوپر اس توانائی کے بہت سارے اثرات مرتب ہوتے ہیں، جن میں سے کچھ یہاں بتائے جارہے ہیں:

☆..... (مثبت) کائناتی توانائی انسان کو صحتمند رہنے میں مدد دیتی ہے۔

☆..... ذہنی تناؤ کو دور کرکے راحت، خوشی، سکون اور اطمینان کا احساس دیتی ہے۔

☆..... آدمی کے اندر مثبت تبدیلیاں پیدا کرتی ہے، یعنی نرمی، رحمدلی، صلح جوئی، انکساری، صبر و برداشت کی قوت۔

☆..... طبیعت میں محبت، ہمدردی اور غمگساری کی خوبیاں پیدا کرتی ہے۔

☆..... مزاج میں ٹھہراؤ اور سنجیدگی پیدا کرتی ہے۔

☆..... منفی اور جارحانہ رویوں سے بچنے میں مددگار رہتی ہے۔

☆..... مثبت کاموں، یعنی تعمیری اور نفع بخش کاموں میں مشغول رکھتی ہے۔

مثبت توانائی بڑھانے کے لئے مثبت سوچ رکھنا ضروری ہوتا ہے، یہی مثبت سوچ، مثبت کاموں کی طرف مائل کرتی ہے۔ غصہ، لڑائی، جھگڑا، چیخ پکار، بحث و تکرار، جھوٹ، لغو گوئی، حسد، نفرت، غیر ضروری فکر و دباؤ، سب منفی رویے ہیں، ان کے غالب ہونے کی صورت میں مثبت توانائی ماند پڑ جاتی ہے۔ یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مثبت توانائی کے کمزور ہونے سے ہی یہ سب منفی رویے صادر ہوتے ہیں، اخلاقی برائیاں سرزد ہوجاتی ہیں اور پھر مثبت توانائی کے کم ہوجانے کی صورت میں بیمار ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

کائناتی توانائی اور نماز کا تعلق

ہم بتا چکے ہیں کہ کائناتی توانائی (مثبت توانائی) کو حاصل کرنے میں نماز پوری طرح مدد دیتی ہے۔ یہاں میں دو مثالوں سے بات کو سمجھانے کی کوشش کروں گی:

1- ہم ابھی اوپر پڑھ آئے ہیں کہ کائناتی توانائی صبر و برداشت کی قوت پیدا کرتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے: (**واستعینوا بالصبر والصلاۃ**) (سورہ بقرۃ:45) صبر اور نماز سے مدد لو۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت میں صبر و صلوٰۃ کے درمیان جو واؤ آیا ہے: وہ بیانیہ ہے، یعنی وضاحت کے لئے آیا ہے، اس صورت میں آیت کا ترجمہ ہوگا: ''صبر سے یعنی نماز سے مدد لو۔'' یعنی نماز جو اطمینان سے پڑھی جائے، وہ آدمی کے اندر مصیبت، غم، مشکل کے اوقات میں بھی صبر، ہمت اور حوصلہ پیدا کرتی ہے۔

یہاں موضوع سے متعلق ایک بات اور کہہ دیں کہ سیرت کی کتابوں میں ہمیں ملتا ہے: جب کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پریشانی، فکر لاحق ہوجاتی تو آپ فوراً نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے۔

2- قرآن کریم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: **اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ۔** (سورہ عنکبوت:45) نماز فحش اور ناگوار امور (باتوں، کاموں) سے روکتی ہے۔ ہم نماز میں کعبہ کی طرف رخ کرکے اور رکوع و سجود کے ذریعہ سے مثبت انرجی اخذ کرتے ہیں۔ (جب آدمی کے اندر مثبت انرجی بڑھ جاتی ہے تو وہ خود بخود ہی منفی چیزوں سے، منفی کاموں سے، منفی خیالات سے، منفی امور سے دور ہوجاتا ہے) صحیح اور اطمینان سے، خشوع و خضوع کے ساتھ ارکان کی رعایت کرتے ہوئے نماز ادا کی جائے تو وہ آج بھی اس پر قادر ہے کہ ہمیں ہر قسم کے گناہوں سے، غلط خیالات سے، غلط امور، غلط کاموں، غلط

باتوں سے، برے اخلاق سے، برے رویوں سے بچالے۔ ہم نماز بھی پڑھ رہے ہیں، جھوٹ بھی بول رہے ہیں، غیبت بھی کررہے ہیں، حسد بھی کررہے ہیں، لڑائی بھی کررہے ہیں، چیخ پکار، بحث وتکرار بھی کررہے ہیں، حق تلفی بھی کررہے ہیں، تو اس کا صاف مطلب ہے کہ نماز کی تاثیر تو آج بھی باقی ہے ہم ہی نماز صحیح نہیں ادا کررہے ہیں، بس فرض سمجھتے ہوئے وقت آنے پر پانچ منٹ کے اندر دو چار سجدے کرتے ہیں، پھر فرار ہوجاتے ہیں۔ ایسی نماز جو بے توجہی سے ادا کی جائے، وہ نہ تو قبول کی جاتی ہے، اور نہ آدمی کو مثبت توانائی دیتی ہے۔ اسی لئے آج ہم میں نماز پڑھنے کے باوجود کوئی مثبت تبدیلیاں دیکھنے کو نہیں ملتی ہیں۔ بلکہ ہم آج اخلاقی پستی کا بھی شکار ہیں، اور خرابی صحت کا بھی۔ سورہ عنکبوت کی یہی آیت ہے، جس نے سب سے پہلے مجھے کائناتی توانائی کے دروس کے دوران اس کے فوائد کو نماز سے ہم آہنگ کرکے دیکھنے پر مائل کیا، یوں یہ پوری جستجو محض اللہ کے کرم اور توفیق سے ایک مضمون کی شکل میں ڈھل گئی۔

اب ہم یہاں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا حال جانیں گے:

سیرت کی کتابوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں کے احوال بہت وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، میں ان میں سے صرف دو نمونے نقل کررہی ہوں:

1- حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز (تہجد) پڑھی، آپ نے سورہ البقرہ شروع کی، مجھے خیال آیا کہ شاید آپ سو آیات پر رکوع کریں گے، مگر آپ سو آیات سے آگے گذر گئے، تو مجھے خیال ہوا کہ شاید اس رکعت میں پوری سورہ پڑھ لیں۔ جب سورہ ختم ہوئی تو مجھے خیال ہوا کہ شاید اب رکوع کریں، پھر آپ نے سورہ آل عمران شروع کردی، اسے پورا مکمل کیا، پھر آپ نے سورہ نساء شروع کردی، اسے بھی بہت اطمینان سے پڑھتے رہے، جب ایسی آیت سے گذرتے، جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ تسبیح بیان کرتے، جب کہیں سوال کا ذکر ہوتا تو آپ اللہ سے مانگتے، اور جہاں پناہ مانگنے کا ذکر ہوتا تو آپ پناہ مانگتے، پھر آپ نے رکوع کیا، اس میں: ''سبحان ربی العظیم'' پڑھتے رہے، آپ کا رکوع بھی تقریباً آپ کے قیام ہی کے برابر طویل تھا، پھر آپ نے ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کہا، اور کھڑے ہوگئے، آپ کا یہ قومہ بھی لگ بھگ رکوع کے برابر طویل تھا، پھر آپ نے سجدہ کیا اور ''سبحان ربی الاعلیٰ'' پڑھتے رہے، آپ کا سجدہ بھی قومہ کے لگ بھگ طویل تھا۔

2- عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ وہ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ساتھ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز شروع کردی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا طویل سجدہ کیا کہ عبدالرحمٰن بن عوف کو گمان گذرا کہ کہیں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پرواز نہ کرگئی ہو۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انفرادی نمازوں کا حال تھا، جماعت کی نماز آپ طویل نہیں کرتے تھے، لیکن وہ بالکل مختصر بھی نہیں ہوا کرتی تھی، سعودی عرب کے ایک عالم دین نے مختلف روایات و واقعات کو جمع کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز باجماعت اتنی بھی مختصر نہیں ہوا کرتی تھی، جتنی آج کل ہمارے درمیان رائج ہوگئی ہے۔ انہوں نے ان روایات سے استدلال کیا ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض بعض سورتوں کا بڑھنا صراحتاً ذکر کیا گیا ہے۔

ہمارا مزاج ہی ایسا ہوگیا ہے کہ ہم نماز کو چھوڑ کر ہر کام کو غیر محدود وقت دیتے ہیں، نیند کے وقت کی کوئی تحدید نہیں، کھانے کے اوقات کو محدود نہیں کرتے، اس وقت تک کھاتے ہیں، جب تک پیٹ نہ بھر جائے، دوستوں سے گپ شپ لگانے میں بھی وقت کا کچھ خیال نہیں کہ کتنا گذر گیا، پکوان، یا خریداری کے وقت بھی

وقت کا لحاظ نہیں رہتا، ہاں اگر وقت دیکھتے ہیں تو قرآن پڑھتے ہوئے یا نماز پڑھتے ہوئے، یا مسجد چلے جائیں تو.....

نماز کے فوائد وضو سے ہی شروع ہوجاتے ہیں۔ وضو کرتے ہوئے ہم ہاتھ پیر، چہرہ، کان، سر اور گردن کے ایکیو پریشر پوائنٹس کو بیدار کردیتے ہیں۔ جن کی وجہ سے جسم میں خون کی دوران صحیح رہتی ہے۔ وضو میں ہاتھ پیر اچھی طرح دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔ آج اس کی حکمت یوں سمجھ آتی ہے کہ وضو کے اعضاء کو رگڑنے سے جسم کی رگوں میں توانائی بحال ہوجاتی ہے۔ تاہم یہ ایک الگ موضوع ہے، پانی کا کائناتی توانائی سے ایک خاص ربط دیکھا گیا ہے۔ بحیثیت ایکیو پریشر تھیراپی طالب علم کے، میں ان شاء اللہ وضو کے فوائد پر بھی ضرور لکھوں گی، جو اسی مضمون کا تکملہ ہوگا۔

خلاصہ کلام:

مجھے معلوم نہیں کہ میں اپنی بات سمجھانے میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں؟ تاہم آسان الفاظ میں، میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ انسان کی جسمانی، روحانی، اخلاقی صحت میں کائناتی توانائی کے کردار کا جو قدیم و جدید فلسفہ ہے، جسے پانے کے لئے لوگ یوگا، رے کی، یا اس جیسی دوسری مشقیں کرتے ہیں، نماز اس پر پوری طرح کامیاب اترتی ہے، بلکہ یوگا اور دوسری مشقوں سے کہیں بڑھ کر فائدہ دیتی ہے، تاہم یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ نماز ریاضت سے بڑھ کر عبادت ہے، اسے عبادت سمجھ کر ہی پڑھنا چاہئے۔ نماز کی شان بہت اعلیٰ اور ارفع ہے، کسی چیز سے اس کا تقابل نہیں کیا جاسکتا، میرا رب بہت علم اور حکمت والا ہے، وہ جس چیز کا حکم کردے، اس میں خود انسان کے فائدے پنہاں ہوتے ہیں، مگر انسان کی عقل ان تک نہیں پہنچتی، نماز کے جو سائنسی فائدے اب سامنے آئے ہیں، وہ ابھی ماضی قریب تک بھی لوگ نہیں جانتے تھے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ نماز کے فوائد یہیں ختم نہیں ہوجاتے، ابھی انسانی عقل اور ترقی کرے گی، شعور و آگہی کی جتنی منزلیں سر ہوں گی، انسان، علم کی روشنی میں نماز کے عجائبات اور حیرت انگیز فوائد سے واقف ہوتا چلا جائے گا، مگر وہ بھی اس کا محدود علم ہی ہوگا۔

حرف آخر

جو چیز اس مضمون کو لکھنے کا محرک بنی، وہ مسلم حلقوں میں یوگا کے فوائد پر کئے جانے والے چرچے ہیں، اچھے اچھے قلمکاروں نے اپنا زور قلم یوگا کے فوائد سے مسلم عوام کو روشناس کرانے میں صرف کیا ہے، بعض ایسے مضامین میں نے خود پڑھے ہیں، مسلسل یوگا کے فوائد پر سائنسی تحقیقات پیش کی جارہی ہیں، جس سے بلا مبالغہ ہمارا روشن خیال طبقہ متاثر ہورہا ہے اور کہیں کہیں سے یوگا کو محض ایک ورزش کے طور پر قبول کرنے کی بھی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ مجھے اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا بھرپور احساس ہے، اس کے باوجود میں متبادل طب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یوگا کے فلسفہ کو جتنا جانتی ہوں، اسی سے لوگوں کو واقف کرانا، اور یوگا کے گرد و غبار میں سے نماز کی شان کو بلند کرنا اپنا ایمانی فرض سمجھتی ہوں۔ سائنسی و طبی تحقیقات سے ہٹ کر یوگا کے مقابلہ میں نماز کی افضلیت کا جائزہ میری اپنی جستجو اور تحقیق ہے، ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے توانائی کی لہروں اور ان سے علاج کے بارے میں جو مطالعہ کیا ہے، درج بالا مضمون اسی کا خلاصہ ہے، غایت درجہ احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اپنے والد محترم (مولانا محمد عابد ندوی صاحب) اور اپنے عزیز ترین بھائی (مفتی عبدالرحمٰن سعید ندوی سلمہٗ) اور رفیق حیات (مولوی محمد عمر علی ندوی صاحب) سے اس مضمون پر نظر ثانی کروائی ہے۔ تاہم تقاضائے بشریت سے اگر کہیں کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو اہل علم کی توجہ اور اصلاح میرے نزدیک بدرجۂ اولیٰ قابل قبول ہوگی۔ اس کے لئے آپ جس بھی اخبار میں یہ مضمون پڑھ رہے ہوں، صرف روزنامہ منصف حیدرآباد کے ادارتی صفحہ کے کالم ایڈیٹر کے نام میں ہی لکھیں۔

وما توفیقی الا باللہ۔

□□□

مفتی عثمان الدین

اسلام میں ادائیگی حقوق کی اہمیت

قرآن کریم کے تیسویں پارے میں ایک سورت ''سورۃ المطففین'' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی ابتدائی آیات میں، ایک گناہ کا ذکر کرکے، اس کے ارتکاب کرنے والوں کو قیامت کے دن اور برے انجام سے ڈرایا ہے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اس گناہ کا نام ''تطفیف'' ہے۔ ''تطفیف'' کے لفظی معنی ''ناپ تول میں کمی'' ہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں لین دین عام طور پر ناپ تول کے ذریعہ ہوتا تھا۔ البتہ اس سے مراد عام ہے اور وہ ''حق دار کے حق کو ادا کرنے میں کمی کوتاہی کرنا'' ہے۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، جس میں انسان کی زندگی سے متعلق ہر شعبہ کے احکام تفصیل سے موجود ہیں۔ حقوق کا لین دین بھی انسان کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے، ہر انسان اپنی زندگی میں حقوق کی ادائیگی اور وصولی کے غیر متناہی سلسلہ میں بندھا ہوا ہے، اس لحاظ سے یہ انسان معاشرہ کا لازمی جز ہے۔ حقوق کے لین دین کے معاملے میں معاشرے کا رویہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لوگ دوسروں سے اپنے حقوق وصول کرنے میں انتہائی چستی اور تیزی دکھاتے ہیں، لیکن جب دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی نوبت آتی ہے تو اس میں کمی کوتاہی اور غفلت وسستی سے کام لیا جاتا ہے، ہر شخص کو اپنے حقوق کی فکر ضرور ہوتی ہے، لیکن اپنے ذمے دوسروں کے حقوق سے غافل ہوتا ہے۔

معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے درمیان، اختلافات، لڑائیوں اور جھگڑوں کی ایک بہت بڑی وجہ بھی یہی رویہ ہے، چنانچہ لوگ اپنے حقوق وصول کرنے کے لئے آپس میں دست وگریبان نظر آتے ہیں۔

قرآن وحدیث میں حقوق کی ادائیگی کی انتہائی سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے، اس سلسلے میں اسلام کی تعلیمات اور ہدایات بہت واضح طور پر کثرت کے ساتھ موجود ہیں، اگر معاشرے میں بسنے والا ہر انسان ان تعلیمات کے مطابق دوسروں کے حقوق ادا کرنے والا بن جائے تو لوگوں کے درمیان حقوق کے حوالے سے یہ کشمکش ہی ختم ہوجائے گی اور انسانی معاشرے میں امن وسکون کی فضا قائم ہوجائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں مذکورہ سورت کی ابتدائی آیات میں ان لوگوں کے لئے ہلاکت اور برے انجام کی خبر دی ہے جو دوسروں سے اپنا حق پوری طرح وصول کرتے ہیں، لیکن دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کمی کوتاہی اور غفلت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''کیا ایسے لوگوں کو گمان نہیں ہے کہ یہ لوگ (قیامت کے) اس بڑے دن میں دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، جس دن سب لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے (حساب کتاب کے لئے کھڑے ہوں گے؟''

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اپنے حقوق مکمل وصول کرتے ہوئے، دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کمی کوتاہی کرنے سے اس گناہ کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے، اس لئے اس کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص اپنے حقوق بھی وصول نہیں کرتا ہے اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں بھی کمی کوتاہی کرتا ہے تو وہ بھی گناہگار ہے اور اس سزا کا مستحق ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنے حقوق حاصل کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے، اب اگر وہ اپنے حقوق سے خود ہی دست بردار ہوتا ہے تو اس سے اس کو دوسروں کے حقوق تلف کرنے کی اجازت ہرگز نہیں ہوگی، اس لئے انسان کو ہر صورت دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرنا

ضروری ہے۔

احادیث طیبہ میں بھی دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف ہے کہ ''جس نے اپنے کسی بھائی کے ساتھ ظلم وزیادتی کی ہو، اس کی آبروریزی کی ہو یا کسی دوسرے معاملہ میں حق تلفی کی ہو، اس کو چاہئے کہ آج ہی اس زندگی میں اس سے معاملہ صاف کرالے، آخرت کے دن آنے سے پہلے کہ جب اس کے پاس ادا کرنے کے لئے دینار و درہم کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اگر اس کے پاس نیک اعمال ہوں گے تو اس کے ظلم کے بقدر وہ مظلوم کو دلادیئے جائیں گے اور اگر اس کے پاس نیک اعمال نہیں ہوں گے تو مظلوم کے کچھ گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے جائیں گے۔'' (صحیح بخاری)۔ دوسری حدیث کا مفہوم ہے کہ ''انسان کے نامہ اعمال میں گناہوں کی ایک فہرست وہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ انصاف کے بغیر نہیں چھوڑے گا اور وہ انسانوں کی آپس کی زیادتیاں اور حق تلفیاں ہیں کہ ان کا بدلہ ضرور دلایا جائے گا۔'' (بیہقی فی شعب الایمان)

مفسرین حضرات نے قرآن کریم کی ان آیات کی تفسیر میں ایک بہت اہم بات یہ بھی ذکر کی ہے کہ حقوق کی دو قسمیں ہیں۔ حقوق اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق جیسے نماز، روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ حقوق العباد، یعنی بندوں کے حقوق جو آپس میں ایک دوسرے کے ذمے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں مذکور ''تطفیف'' کا یہ گناہ حقوق کی ان دونوں قسموں کو شامل ہے۔ چنانچہ انسان جس طرح حقوق العباد کی ادائیگی میں کمی کوتاہی کرنے سے، اس گناہ کا مرتکب ہوکر، سزا کا مستحق ہوتا ہے، اسی طرح حقوق اللہ کی ادائیگی میں کمی کوتاہی کرنے والا بھی اس گناہ کا مرتکب ہوگا اور سزا کا مستحق ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز کے رکوع سجدے پوری طرح ادا نہیں کررہا تھا اور جلدی جلدی نماز ختم کررہا تھا تو اس سے فرمایا کہ ''تو نے اللہ کے حق میں تطفیف کردی ہے۔''

غرض یہ کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی صحیح طرح اور مکمل ادائیگی انتہائی ضروری ہے۔ ان کی ادائیگی میں کمی کوتاہی، غفلت اور بے پرواہی، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن وحدیث کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وقت کی اہمیت

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ ایک مدت تک میں صوفیائے کرام کے پاس رہا، ان کی صحبت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ وقت تلوار کی مانند ہے، آپ اس کو (عمل کے ذریعہ) کاٹئے ورنہ وہ آپ کو (حسرتوں میں مشغول کرکے) کاٹ ڈالے گا۔

امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ دن رات کی گردش آپ کی عمر کم کررہی ہے، تو آپ عمل میں پھر کیوں سست ہیں۔ ان سے ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ یہ کام کل تک مؤخر کردیجئے، آپ نے فرمایا کہ میں ایک دن کا کام بمشکل کرتا ہوں، آج کا کام اگر کل پر چھوڑ دوں تو دو دن کا کام ایک دن میں کیسے کروں گا۔ مثل مشہور ہے کہ وقت پر ایک ٹانکا سو ٹانکوں سے بچالیتا ہے۔ مشہور تابعی عامر بن عبدالقیس کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے ایک مرتبہ کسی نے کوئی بات کہنا چاہی (ظاہر ہے کہ بامقصد بات ہوگی) تو فرمانے لگے کہ سورج کی گردش روک دو تو تم سے بات کرنے کے لئے وقت نکال لوں (یعنی جو وقت گزر جائے گا، اس کو واپس نہیں لایا جاسکتا۔ لہٰذا وقت کو بے مقصد کاموں اور باتوں میں ضائع نہیں کرنا چاہئے) حدیث شریف میں آتا ہے کہ آدمی کے اسلام کے حسن میں سے ایک بات یہ ہے کہ انسان فضول مشاغل ترک کردے۔ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکے کا شکار ہیں، ایک صحت اور دوسری فراغت۔

مولانا محمد جہان یعقوب

غزوات نبوی علی صاحبہا التحیۃ کا سن وار تذکرہ

غزوہ بدر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں یہ غزوہ واقع ہوا۔ قریش کے قافلے کو جو شام سے آرہا تھا، روکنے کے لئے 12 رمضان 2 ہجری حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ ہوئے، لیکن وہ قافلہ راستہ کاٹ کر نکل گیا اور کفار مکہ کا ایک بڑا لشکر مقام بدر پر مقابلے کے لئے آپہنچا۔ 17 رمضان 6 ہجری کو غزوہ بدر کا مشہور واقعہ پیش آیا، جس میں مسلمان کل تین سو تیرہ تھے، ان کے پاس کل دو گھوڑے، چند تلواریں اور ستر اونٹ تھے، ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی سوار تھے۔ دوسری طرف کفار کے لشکر میں ایک ہزار کے قریب جوان تھے، جو تمام کے تمام ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو بہت بڑی فتح عنایت فرمائی۔ قریش کے وہ سردار جنہوں نے ہجرت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا مشورہ دیا تھا اور جن کی تعداد چودہ تھی، ان میں سے گیارہ اس معرکے میں مارے گئے، جن میں ابوجہل بھی شامل تھا۔ تقریباً انسٹھ آدمی اُن کے علاوہ مارے گئے۔ ستر کفار گرفتار کئے گئے۔ یوں کفار کا غیر معمولی نقصان ہوا۔ اس کے مقابلے میں مسلمان کل بارہ شہید ہوئے۔ جو ستر کفار گرفتار ہوئے تھے۔ اُن کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ فدیہ کی مقدار چار ہزار درہم تھی۔ جن کے پاس کچھ نہ تھا، ان کا فدیہ یہ قرار دیا گیا کہ دس مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھادیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نظر میں تعلیم کی کتنی اہمیت ہے۔

نوٹ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں چھوڑ دیا تھا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سخت بیمار تھیں۔ غزوے سے فتح کی خبر جب مدینہ منورہ پہنچی تو لوگ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی تدفین سے فارغ ہو چکے تھے۔

غزوہ احد

7 شوال بروز دوشنبہ 3 ہجری میں اُحد پہاڑی کے پاس وہ مشہور جنگ ہوئی، جس کو ''غزوہ اُحد'' کہتے ہیں۔ جنگ کی قیادت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی اور مدینہ منورہ میں اپنا خلیفہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا۔ اسلام کا جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ جب کہ کفار کی کمانڈ ابوسفیان کے پاس تھی۔

اس جنگ کی وجہ یہ تھی کہ کفار مکہ نے تین ہزار فوج کی جمعیت لے کر غزوہ بدر کا بدلہ لینے کے لئے مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اطلاع سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو مشورے کے بعد اللہ کے نام سے سات سو مسلمان مقابلے کے لئے نکلے۔ اوّل اوّل منافقین کا سردار عبداللہ بن ابی بھی تین سو کی فوج لے کر مسلمانوں کے ساتھ چلا، مگر پھر غداری کی اور راستے ہی سے واپس ہوگیا۔ مسلمان بے سروسامانی میں تھے اور کافروں کے پاس سات سو زرہیں، دو سو گھوڑے، تین ہزار اونٹ تھے اور ان کے جوشِ جنگ کی یہ حالت تھی کہ چودہ عورتیں بھی جنگی ترانے پڑھنے اور لڑنے والوں کو جوش دلانے کے لئے ساتھ آئی تھیں۔ چنانچہ فوجیں ترتیب دی گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ، پچاس آدمیوں کا، اسلامی فوج کی پشت کی طرف اُحد پہاڑی پر بٹھادیا، تاکہ

اس طرف سے حملہ نہ ہوسکے۔ آپ نے انہیں وصیت بھی فرمائی تھی کہ جنگ کا جو بھی نتیجہ اور میدان کا جو بھی نقشہ ہو، وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ اوّل اوّل مسلمانوں کو فتح ہوئی اور غنیمت کا مال لینا بھی شروع کردیا، جب گھاٹی پر مامور تیراندازوں نے یہ صورت حال دیکھی تو ان میں اختلاف رائے ہوگیا۔ بعض نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم حالتِ جنگ کے ساتھ خاص تھا۔ اب جب فتح ہوچکی، تو ہمیں بھی نئی خدمت یعنی مال غنیمت جمع کرنے میں حصہ لینا چاہئے۔ جب کہ امیر لشکر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے حضرات کا کہنا تھا کہ نہیں ہمیں یہیں رہنا چاہئے۔ پہلے والے لوگوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ کفار نے جب گھاٹی خالی دیکھی تو پلٹ کر حملہ کردیا، امیر سمیت وہاں موجود صحابہ کو شہید کرکے میدان میں پہنچ گئے۔ مسلمانوں کے لئے یہ افتاد غیر متوقع تھی۔ ان کے سنبھلنے تک جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ فتح شکست میں تبدیل ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگئے، آپ کا دندان مبارک شہید ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک کافر عبداللہ بن قمیہ نے موقع پاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تلوار سے حملہ کردیا، جس کی وجہ سے چہرہ انور میں خود کی دو کڑیاں گھس گئیں، جن کو ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے اپنے دانتوں سے نکالا، ان کے دو دانت بھی شہید ہوگئے۔ کفار تیر برسا رہے تھے، جن کو صحابہ کا ہجوم اپنے اوپر لے رہا تھا۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ حملوں کے سامنے کمر کئے ہوئے تھے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بازوؤں پر تیروں اور تلواروں کے حملے لے رہے تھے۔ آپ کا بازو شل ہوگیا اور ستر زخم بدن مبارک پر آئے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا، مگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر اب بھی یہی تھا:

اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما، وہ مجھے پہچانتے نہیں۔

اس جنگ میں ستر مسلمان شہید ہوئے، جن میں علمبردار حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، ان کے بعد جھنڈا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے سنبھالا۔ بائیس یا تیئیس کفار قتل ہوئے۔

غزوہ بنونضیر

4 ہجری میں یہود بنونضیر نے اپنی عداوت اور قریش کے بھڑکانے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش تیار کی، جس پر ان کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کردیا گیا اور وہ خیبر جاکر آباد ہوگئے۔ اسے غزوہ بنونضیر کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ غزوہ ماہ ربیع الاول 4 ہجری میں لڑا گیا۔ اس میں اسلامی لشکر کی سرداری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی، جب کہ مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ حضرت عبداللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ مقرر کئے گئے تھے۔ اسلامی لشکر کے علمبردار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ یہودیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا، اس کے مطابق یہ طے پایا تھا کہ یہودی اور مسلمان مل کر رہیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں ساتھ نہیں دیں گے۔ اس کی مخالفت سب سے پہلے بنوقینقاع نے کی تھی، چنانچہ ان کو جلاوطن ہونا پڑا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ بنونضیر نے بھی اس معاہدے کی مخالفت کردی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش تیار کی، لہٰذا اسی مقصد کے لئے بنونضیر کے سردار حیی بن اخطب نے اپنے لشکر کو جنگ کی تیاری کے لئے حکم دے دیا۔ مسلمانوں نے ان پر چڑھائی کردی، جس کے نتیجے میں وہ لوگ قلعہ میں بند ہوگئے۔ کچھ دن ان کا محاصرہ کیا، جو کہ چھ دن جاری رہا، جس کے نتیجے میں وہ مدینہ منورہ سے نکلنے کے لئے تیار ہوگئے۔ جو کچھ سامان اُونٹوں پر لے جاسکتے تھے وہ ساتھ لے گئے، باقی سامان ضبط کرلیا گیا۔

غزوہ خندق

یہ غزوہ تاریخ اسلام کا اہم غزوہ ہے۔ جب ہر مرتبہ کفار کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو پورے عرب کے یہودی اور مشرک اکٹھے ہوگئے اور اسلام کو جڑ سے اکھاڑنے کے ناپاک عزائم لئے ماہ ذیقعدہ 5 ہجری کو دس ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ مسلمانوں کو جب معلوم ہوا کہ کفار حملے کے لئے آرہے ہیں اور ان کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ منافقین علاحدہ آستین کا سانپ بنے ہوئے ہیں، مدینہ منورہ کے باقی ماندہ یہودیوں (یہودی

بنوقریظہ) نے بھی مسلمانوں سے غداری کر کے کفار کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس صورت حال میں یہ مناسب نہیں تھا کہ مدینہ منورہ سے باہر نکل کر جنگ کی جائے، چنانچہ مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے مقابلہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لہٰذا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق خطرناک ناکوں پر خندق کھودی گئی۔ یہ تدبیر کامیاب ہوئی، کفار اس کو پھاند نہ سکے اور مسلمان محفوظ رہے۔ جب کفار کا تقریباً پندرہ ہزار کا لشکر مدینہ پہنچا، تو کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ خندق پھلانگ سکے اور انہوں نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور خندق کے پار سے ہی مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کردیئے، جس سے چھے مسلمان شہید ہوگئے اور دس کفار قتل کردیئے گئے۔ ایک دو کافر پھاند بھی آئے، جن سے تلوار کی دوبدو جنگ ہوئی، پندرہ روز کے محاصرہ کے بعد کفار کا سامانِ رسد ختم ہوگیا اور ساتھ ہی ساتھ آسمانی آفتوں، ان کی باہمی پھوٹ اور سامانِ رسد کے ختم ہونے کی وجہ سے ان کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔

غزوۂ بنو قریضہ

یہ غزوہ ماہ ذی الحجہ سنہ 5 ہجری میں لڑا گیا۔ اس غزوہ کی سرداری بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی۔ اس غزوہ میں علمبرداری کی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کی گئی۔ یہ جنگ بنوقریضہ کے خلاف تھی۔ جن کا جرم یہ تھا کہ غزوہ خندق کے موقع پر بنوقریضہ نے اول تو دھوکا دیا اور مسلمانوں سے غداری کر کے کفار کا ساتھ دیا، دوسرے یہ کہ ان کو بھڑکانے والا اسلام کا باغی بنونضیر کا سردار حیی بن اخطب ان کے پاس ہی چھپا ہوا تھا۔ لہٰذا غزوہ خندق سے فراغت کے بعد فوراً ہی بنوقریضہ پر حملہ کیا گیا، لڑائی کے نتیجے میں یہودیوں کے چار سو آدمی قتل اور دو سو قید ہوئے۔ وہ لوگ قلعوں میں گھس گئے تو مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کرلیا، جب محاصرہ طویل ہوگیا، تو انہوں نے مجبور ہو کر قبیلہ اوس کے مسلمانوں کو بیچ میں ڈالا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی: ''اوس'' کے سردار (حضرت) سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) ہمارے حق میں جو بھی فیصلہ فرمائیں گے، وہ ہمیں قبول ہوگا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان کی شریعت کے مطابق فیصلہ صادر کیا کہ ان کے باغی مردوں کو قتل کیا جائے، عورتوں، بچوں کو غلام بنایا جائے اور ان کا تمام مال مسلمانوں میں تقسیم کردیا جائے۔

غزوہ خیبر

یہ غزوہ ماہ محرم الحرام 7 ہجری میں واقع ہوا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً سولہ سو تھی۔ اسلامی لشکر کی قیادت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی، مدینہ منورہ کا خلیفہ حضرت سباعہ بن ابی عرفہ رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔ چونکہ بنونضیر کے یہودیوں نے مدینہ منورہ سے جا کر خیبر کو اپنی سازشوں کی پناہ گاہ بنالیا تھا اور وہ خیبر میں مسلمانوں کے خلاف آگ اُگل رہے تھے، حفاظتِ اسلام کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کی سازشوں کو ختم کیا جائے، لہٰذا ان پر چڑھائی کی گئی، یہ جنگ ''غزوہ خیبر'' کہلاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو شاندار فتح دی اور خیبر کے تمام قلعے مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ مسلمانوں نے فتح کے باوجود یہودیوں کو قلعہ سے نکالا نہیں، بلکہ ان سے ایک معاہدہ کرلیا، جس کے مطابق مسلمان جب تک چاہیں یہودیوں کو قلعے میں رہنے کی اجازت دیں گے اور تجارت کا ایک حصہ مسلمانوں کو دیا جائے گا۔ خیبر کے بعد ''فدک کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ ہوئے، وہاں کے لوگوں نے صلح کرلی۔

غزوۂ موتہ

یہ لڑائی جمادی الاولیٰ 8 ہجری میں ہوئی۔ اس جنگ کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بصریٰ کے حاکم ''شرحبیل'' کو دعوت اسلام دینے کے لئے حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو اپنے نامہ مبارک کے ساتھ روانہ کیا۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کو شہید کردیا، اس کی سزا کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لشکر روانہ کیا۔ اس لشکر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو شرکت نہیں فرمائی تھی، لیکن پھر بھی اسے غزوہ اس لئے کہا گیا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر کو بہت خاص خاص نصیحتیں فرمائی تھیں۔ اسلامی فوج کی تعداد

صرف تین ہزار تھی۔ جب کہ شرحبیل کی فوج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔ اسلامی لشکر کا سردار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا گیا، مگر ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ اگر یہ شہید ہوجائیں تو حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو سردار مقرر کیا جائے اور اگر وہ بھی شہید ہوجائیں تو حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو سردار مقرر کیا جائے۔ وہ بھی شہید ہوجائیں، تو مسلمان جس کو چاہیں اپنا امیر بنالیں۔ ان مٹھی بھر مسلمانوں کا کفار کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے اس قدر رعب بٹھایا کہ دشمن پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق تینوں علمبردار شہید ہوگئے، ان کے بعد جھنڈا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور انہوں نے دشمن کا اس زور سے مقابلہ کیا کہ فتح ونصرت نے اسلامی لشکر کے قدم چومے اور کفار کا سب غرور خاک میں مل گیا۔

غزوہ فتح مکہ

صلح حدیبیہ کی مدت اگرچہ دس سال رکھی گئی تھی، اس معاہدے میں ایک بات یہ بھی تھی کہ دونوں فریقوں کے حلیف قبائل سے اگر کوئی جنگ کرے تو مخالف فریق کی کسی قسم کی مدد نہ کی جائے گی۔ معاہدے کے دوسرے ہی سال یعنی آٹھ ہجری میں بنوخزاعہ پر بنوبکر نے حملہ کردیا اور قریش نے بنوبکر کی امداد کی، حالانکہ معاہدے کے مطابق وہ اس کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ یوں قریش نے عہد شکنی کرکے اس تمام معاہدے کی دھجیاں اڑادیں۔ بنوخزاعہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں شکایت پیش کی اور امداد کی درخواست کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درندگی کا بدلہ لینے کے لئے تیاری کا حکم فرمایا اور دس ہزار کا لشکر جرار لے کر مکہ کے قریب ''مرالظہران'' تک پہنچ گیا۔ اسلامی لشکر کی سرداری نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی۔ حضرت ابورہم کلثوم بن حصین غفاری رضی اللہ عنہ یا حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا خلیفہ مقرر کیا گیا۔ جب لشکر مکہ پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلان ہوا کہ جو ہتھیار ڈال دے گا وہ قتل نہیں کیا جائے گا، لہٰذا لڑائی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے قریش پر رحم کھا کر ابوسفیان کو مشورہ دیا کہ باز آجائیں اور توبہ کرلیں، چنانچہ قریش کے سردار ابوسفیان نے اسلام قبول کرلیا۔ رضی اللہ عنہ!

اس کے باوجود کچھ لوگ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے سامنے آگئے، جن سے مجبوراً مقابلہ کیا گیا اور دو مسلمان شہید، جب کہ ستائیس یا اٹھائیس کفار قتل ہوئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں انتہائی خشوع اور عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے خود مکہ کے نیچے کی جانب داخل ہوئے، جب کہ فوج کو حکم فرمایا کہ مختلف راستوں سے داخل ہوجائے۔ تمام لوگوں کے لئے عام معافی کا اعلان کردیا گیا تھا، اس لئے نہ لڑائی ہوئی، نہ قتل وخون خرابہ، چند آدمیوں کے علاوہ کسی سے کوئی بدلہ نہ لیا، بلکہ سب کو معاف فرمادیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں موجود بتوں کو گرادیا، خانہ کعبہ کا طواف کیا اور پندرہ روز مکہ میں قیام فرمایا۔

غزوہ حنین

یہ لڑائی ماہ شوال 8 ہجری میں لڑی گئی۔ ''حنین'' ایک مقام کا نام ہے، جو مکہ معظمہ سے تین منزل کے فاصلے پر طائف کے قریب واقع ہے۔ اس غزوہ کے سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور مدینہ منورہ میں اپنا خلیفہ حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا تھا۔ یہ غزوہ دو قبیلوں ہوازن اور بنی ثقیف کے ساتھ پیش آیا، دشمن کے لشکر کا سردار مالک بن عوف نضری تھا۔

فتح مکہ عرب کے لئے ایک بہت بڑی تبدیلی تھی، جس کے نتیجے میں جو نیک بخت لوگ تھے وہ تو اس فتح کو اسلام کی حقانیت کا اشارہ سمجھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، جب کہ عرب کے دو بڑے قبیلوں بنوہوازن اور ثقیف نے جب مکے کی فتح اور مسلمانوں کی شان وشوکت میں تیزی سے اضافے کو دیکھا تو انہیں اپنی فکر ہونے لگی اور اپنی جنگی مہارت، نیز اپنی کثرت تعداد دکھانے کے لئے انہوں نے بیوی بچوں اور جانوروں سمیت پوری طاقت کے ساتھ حملہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کے مقابلے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تیاری کا حکم دیا، 6 شوال 8 ہجری کو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہوئے، حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ میں اپنا خلیفہ بنایا، مسلمانوں کے لشکر میں تقریباً بارہ سو اسی (1280) افراد تھے، جب کہ مدمقابل عرب کے پورے دو بڑے قبیلوں کے تمام افراد تھے۔ لشکر کی خبر پاتے ہی زیادہ تر دشمن پہاڑوں کی اوٹ سے ان پر دھاوا بول دیا۔ اس سے کچھ مسلمانوں میں پسپائی آئی، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بڑے بڑے صحابہ جمے رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود خچر سے نیچے اترے اور تلوار گھمانی شروع کردی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آواز دی، جس پر سارے مسلمان اکٹھے ہوگئے اور تھوڑی دیر میں لڑائی کا پانسا پلٹ گیا، مسلمانوں نے ایسی دلیری سے دشمن کے لشکر پر جھپٹا مارا کہ جارح دشمن بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس جنگ میں چار یا چھ مسلمان شہید، جب کہ اکہتر (71) کافر مارے گئے۔ فتح کے نتیجے میں بہت سا مال ہاتھ لگا اور چھ ہزار سے زائد آدمی قیدی بنالئے گئے۔

ہوازن اور ثقیف کے یہ شکست خوردہ لوگ حنین سے بھاگ کر طائف کے قلعوں میں آچھپے تھے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا، تقریباً اٹھارہ روز یہ محاصرہ جاری رہا۔ مسلمانوں پر ان لوگوں نے بے انتہا تیر برسائے، چنانچہ بارہ مسلمان شہید اور بہت سے زخمی ہوگئے۔ جس کے جواب میں منجنیق کا استعمال کیا گیا۔ اٹھارہ روز بعد محاصرہ اٹھالیا گیا۔ ان کے غرور کا پورا پورا جواب مل چکا تھا، تاہم ابھی بھی باقاعدہ فتح نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان لوگوں کا ایک وفد مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں ٹھہرایا، تاکہ قرآن شریف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریریں سنیں اور اثر ہو، چنانچہ وہ چند دن مسجد میں ٹھہرے اور مسلمان ہوکر واپس لوٹے۔

طائف سے جب واپس ہوکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ''جعرانہ'' کے مقام پر پہنچے تو ان لوگوں کا وفد آیا اور حنین کے قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی، جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرما کر ان سب کو (جن کی تعداد چھ ہزار تھی) مفت میں، کوئی جرمانہ لئے بغیر رہا کردیا۔ جعرانہ کے مقام سے ایک عمرہ بھی رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور 6 ذیقعدہ 8 ہجری کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ واپس پہنچے۔

غزوۂ تبوک

یہ غزوہ ماہ رجب 9 ہجری میں واقع ہوا، لشکر اسلام کی سرداری حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی، مدینہ منورہ میں آپ کی غیر موجودگی میں خلیفہ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ مقرر کئے گئے تھے، جب کہ بال بچوں کی نگرانی کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا گیا تھا، جب اس بات کی خبر مدینہ منورہ میں پہنچی تو ہرقل بادشاہ روم، موتہ کی جنگ کا بدلہ لینے کے لئے مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کررہا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی سے اس کی روک تھام کے لئے تیس ہزار مسلمانوں کی فوج لے کر مدینہ طیبہ سے روانہ ہوگئے۔ گرمی کا زمانہ تھا اور مسلمان بے حد تنگ دستی اور قحط کا شکار تھے، اس لئے چندے سے فوج کی ضروریات کا انتظام کیا گیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا سارا سامان لاکر پیش کردیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا آدھا سامان لے کر آگئے۔ غرض یہ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم وعلیہن نے اپنی اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر چندے دیے۔ جب وہاں کوئی نہ رہا تھا تو ہرقل بادشاہ حمص چلا گیا تھا اور وہاں کوئی نہ تھا۔ اس سفر سے رومیوں پر بے حد رعب چھا گیا۔ ایلہ کا والی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، امان مانگی اور صلح کے بدلے ٹیکس دینے پر تیار ہوا۔ اس قیام کے زمانے میں نواب اکیدر کو گرفتار کرکے لایا گیا اور دوسرے نوابوں سے بھی معاہدے ہوئے۔ پندرہ روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں قیام فرمایا، پھر واپس تشریف لے آئے اور رمضان المبارک کے مہینے میں مدینہ منورہ پہنچے۔ اسی معرکے سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ضرار کو جلوانے کا حکم دیا، یہ مسجد کے نام پر مسلمانوں کے خلاف منافقین کا ہیڈکوارٹر تھا، جو منافقوں نے مسلمانوں کے خلاف مشورہ کرنے کے لئے بنایا تھا۔

○○

مولانا محمد مجیب الدین قاسمی

اسوۂ ہاجرہ

خواتین کیلئے مشعل راہ

ماہ ذی الحجہ کی آمد کے ساتھ ہی خانوادہ ابراہیم کی عظیم ولاثانی قربانیوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ جگہ جگہ جلسہ ہائے یاد ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام منعقد کئے جاتے ہیں جن میں پورے اہتمام کے ساتھ جدالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بے مثال قربانیوں، آپ کی اولوالعزمی وثابت قدمی اور پیکر رضا وتسلیم زندگی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ آپ کی حیات مبارکہ کے سبق آموز پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے جس سے مرد حضرات کو استفادہ کا بھرپور موقع ملتا ہے۔ نیز حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کی فرمانبرداری واطاعت شعاری کے ذکر سے نوجوان نسل کو احترام والدین اور ان کے احکام کی بجاآوری کی تعلیم دی جاتی ہے، مگر عموماً حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کے درس آمیز گوشوں کو یکسر فراموش کردیا جاتا ہے بایں طور کہ آپ کے حالات زندگی کا بیان ہی نہیں ہوتا یا اگر ہوتا بھی ہے تو اختصار سے کام لیا جاتا ہے جب کہ آپ کی حیات مبارکہ میں خواتین و طالبات کے لئے مختلف سبق آموز عملی نمونے موجود ہیں۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں جہاں ایک اولوالعزم، جفاکش، صابرہ و شاکرہ، قناعت پسند اور خداتعالیٰ پر کامل اعتماد وتوکل کرنے والی اہلیہ کا کردار ہے وہیں ایک بے لوث خدمت گزار ماں اور ذہین وفطین مومنہ بندی کا وصف بھی نمایاں ہے جو ملت کی خواتین و طالبات کو دعوت فکر وعمل دیتا ہے ذیل میں آپ کی حیات مبارکہ کے چند سبق آموز گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا اصلی نام ''ہاغار'' ہے آپ شاہ مصر رقیون کی صاحبزادی ہیں۔ (بعض علماء نے اس بادشاہ کے اور بھی نام بیان کئے ہیں) آپ کا نام ''آجر'' بھی ہے۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ جب بادشاہ مصر نے سارہؓ پر بری نظر ڈالی اور ان کے قریب ہونے کا ارادہ کیا تو اچانک قہر الٰہی میں گرفتار ہوا اور پھر آپؓ ہی کی دعا سے اس عذاب سے نجات پائی اور آپ کی عظمت کا احترام کیا۔ اس لئے فوراً توبہ کی اور معافی مانگ کر اپنی بیٹی ہاغار کو بطور خدمت گزاری کے لئے ہدیتاً دے دی یعنی حضرت سارہؓ اور حضرت ابراہیمؑ کو شاہ مصر سے جو تکلیف پہنچی تھی اس کے بدلے میں انہیں اپنی بیٹی اجر کے طور پر عطا کی تھی، اس لئے آپ کا نام آجر ہوگیا اور آپ کا مشہور ومعروف نام ہاجرہ ہے جو دراصل وصفی نام ہے کیونکہ ہاجرہ کے معنی ہجرت کرنے والی کے ہیں چونکہ آپ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مصر سے فلسطین کی طرف ہجرت فرمائی تھی اس لئے ہاجرہ کے نام سے موسوم ہوئیں۔

(بحوالہ ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم:18)

جب حضرت سارہ رضی اللہ عنہا اولاد سے مایوس ہوگئیں تو اپنی خادمہ ہاجرہؓ کو حضرت ابراہیمؑ کو تحفتاً دے دیا اور حضرت ابراہیمؑ نے حضرت سارہؓ کی مرضی سے حضرت ہاجرہ سے نکاح فرمالیا جس سے حضرت اسماعیلؑ تولد ہوئے۔ حضرت ہاجرہ بڑی عظمتوں اور رفعتوں والی خاتون ہیں جن کا اندازہ آپ کی بے شمار خصوصیات سے لگایا جاسکتا ہے۔ چند خصوصیات یہ ہیں:

آپؓ شاہ مصر کی بیٹی یعنی شہزادی ہیں۔

آپؓ حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ محترمہ ہیں۔

آپ حضرت ذبیح اللہ کی والدہ محترمہ ہیں۔

آپؓ مورثہ ملائکہ ہیں یعنی آپ سے فرشتوں نے گفتگو کی ہے۔

آپؓ مکہ معظمہ کی (زادباللہ شرفاء و عظمۃً) بانیہ ہیں اور سب سے اہم خصوصیات یہ ہے کہ آپؓ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدہ عالیہ ہیں۔

یوں تو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کے مختلف گوشے ہیں مگر ان سب میں نمایاں پہلو اطاعت شعار و متوکلہ بیوی کا ہے۔ چنانچہ جب آپ کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام تولد ہوئے اور ابھی شیر خواری کے ایام میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی بیوی اور بچہ کو اپنے سے جدا کرو اور ایک بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ آؤ جس کو قرآن کی زبانی ''وادی غیر ذی ذرع'' سے موسوم کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پیکر رضا و تسلیم اور بمصداق ''سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے'' تو تھے ہی فوراً حضرت ہاجرہ اور ان کے شیر خوار بچے کو لے کر چلے اور ان کو اس جگہ اتار دیا جہاں آج شہر مکہ آباد ہے، پھر کچھ کھجور اور ایک پانی کا مشکیزہ حوالے کر کے واپس ہونے لگے، اس منظر کو دیکھ کر حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا آپ علیہ السلام کے کپڑوں سے چمٹ گئیں اور عرض کیا ''اے ابراہیمؑ آپ ہمیں یہاں تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ جب کہ کھانے پینے اور رہنے سہنے کا کوئی انتظام بھی نہیں ہے جس سے ہم گذر بسر کر سکیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوئی جواب نہیں دیا، حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اصرار و اضطراب کے ساتھ سوال کرتی جا رہی ہیں لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں۔ بالآخر خود حضرت ہاجرہ نے سوال کیا کہ کیا آپ کو اللہ نے اس کا حکم فرمایا ہے؟ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ''ہاں'' میں جواب دیا تب حضرت ہاجرہ نے بھی کہا ''پھر کوئی پرواہ نہیں وہ ہمیں ضائع نہ کرے گا۔''

اس واقعہ سے حضرت ہاجرہؓ کی اولوالعزمی، خدا تعالیٰ پر کامل توکل، اپنے شوہر کی فرمانبرداری اور تعمیل حکم خداوندی میں معاونت کا پہلو نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ آج اسوۂ ہاجرہؓ کے اس عملی گوشے کی کمی کی وجہ سے معاشرے کا جو حال ہے وہ قابل افسوس ہے جگہ جگہ بیویوں کا اپنے شوہر کی نافرمانی کرنا، عدم قناعت پسندی اور اللہ تعالیٰ کی ذات عالی پر اعتماد و توکل نہ کرنے کی وبا عام ہے۔ اکثر و بیشتر خواتین کی زبانوں پر ناشکری کے کلمات جاری رہتے ہیں بلکہ اپنے شوہروں کی اچھی خاصی یافت کے باوجود عدم کفایت کا رونا تو روزمرہ کا معمول بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے گھروں سے اصلی سکون و راحت رخصت ہو چکا ہے، شوہروں کی عدم اطاعت و بے قدری کی وجہ سے طلاق کی شرح میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور مسلم معاشرہ کثرت طلاق میں سرفہرست بن چکا ہے۔ ان تمام باتوں کی اصل وجہ حضرت ہاجرہؓ کی زندگی کے عملی نمونے اور تعلیمات اسلامی سے دوری ہے۔ ایک کمی یہ بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ اکثر خواتین اپنے گھر والوں (شوہروں) کی کسی دینی تقاضے کو پورا کرنے میں معاون ثابت نہیں ہوتیں۔ الا ماشاء اللہ بلکہ بے شمار دین کے مطالبات ان کے قیل و قال کی وجہ سے پورے نہیں ہو پاتے۔ مثلاً غیر اسلامی رسوم و رواج کی عدم شرکت، فضول خرچی نہ کرنا، سنت نبوی داڑھی کو اپنے چہروں پر زندہ کرنا، اسلامی لباس اختیار کرنا یا کسی تبلیغی مہم میں حصہ لینا وغیرہ۔

جب شوہر ان تقاضوں پر عمل کرنا چاہتا ہے تو خواتین ان میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ غور کریں کہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے اس کسمپرسی کے عالم میں کس ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس طرح وادی غیر ذی زرع میں تنہا چھوڑ کر جانے پر کوئی شکوہ و شکایت نہیں کی بلکہ خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے حضرت خلیل اللہ کی حکم خداوندی کی بجا آوری میں مدد فرمائی۔ ان کی حوصلہ شکنی نہیں بلکہ ہمت افزائی فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیک و صالح بیوی وہ ہے جو ہر حال میں اپنے شوہر کا ساتھ دے، تنگی اور فراخی دونوں میں یکساں سلوک کرے، یعنی فراخی میں فضول خرچی اور تنگی میں جزع فزع نہ کرے بلکہ اعتدال و میانہ روی کے

ساتھ زندگی بسر کرے۔ دین کے ہر چھوٹے بڑے مطالبے کو پورا کرنے میں خاوند کی مدد کرے بلاوجہ قیل و قال کے ذریعے اس کو شکستہ خاطر ہونے نہ دے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا بحیثیت اہلیہ کردار سے یہی سبق ملتا ہے۔

حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کا دوسرا پہلو بے لوث خدمت گذار ماں کا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دیا ہوا توشہ کب تک چلتا بالآخر جب کھجوریں ختم اور مشکیزہ خالی ہوگیا تو ماں اور بیٹا دونوں بھوک و پیاس کی وجہ سے بے چین ہوگئے۔ ماں تو مامتا کی وجہ سے اپنی بھوک و پیاس کو بھلا چکی تھی لیکن جب اپنے لخت جگر کی حالت کو دیکھتیں تو پریشانی بڑھ جاتی اور بے قراری کے عالم میں قریب کی پہاڑیوں (صفا و مروہ) کے درمیان دوڑ لگاتیں تاکہ آس پاس کچھ مل جائے جس سے بچہ کے لئے راحت کا سامان ہوجائے اور پانی وغیرہ کا پتہ مل جائے لیکن بظاہر کوئی سبب نظر نہیں آیا۔ جب آخری مرتبہ مروہ پر چڑھیں تو غیب سے ایک آواز آئی اور آپ رک گئیں پھر یکایک حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قریب زم زم کا چشمہ دیکھا جس سے پانی ابل رہا ہے، حضرت ہاجرہؓ نے اس پانی کو حوض کی شکل میں جمع کرلیا اور کہا: زم زم (رک جا رک جا) اور چلو بھر بھر کر اپنے مشکیزہ میں ڈالنے لگیں، خود بھی پیا اور اپنے لخت جگر حضرت اسماعیل کو بھی پلایا۔

اس واقعہ سے حضرت ہاجرہ کا اپنی اولاد کے لئے جہد و سعی کرنا اور اپنے ہاتھوں سے اس کی پرورش کرنے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ آج اولاد کی ذاتی پرورش کے تئیں امت کی ماؤں کا رویہ بدلتا جارہا ہے۔ اپنی اولاد کی تربیت و پرورش انہیں بوجھ معلوم ہورہی ہے۔ اور ماڈرن ازم کی لت کی وجہ سے کئی مائیں اپنے بچوں کو یا تو کسی نرسری میں شریک کردیتی ہیں یا کسی آیا کے حوالے کرکے مطمئن ہوجاتی ہیں، حالانکہ بچے کی پہلی تربیت گاہ ماں کی گود ہے۔ یہ طرز عمل عموماً سماج کے امراء و رئیس زادیوں کا ہوتا ہے، اس کے برخلاف متوسط طبقے کی کچھ خواتین بھی بچوں کی تربیت و پرورش میں تساہل سے کام لیتی ہیں۔ یعنی ان کے آرام اور راحت رہن سہن اور کھانے پینے کا خیال نہیں رکھتیں۔ ان کے نزدیک بچوں کی تربیت سے زیادہ ٹی وی کے مخرب اخلاق پروگرامس اہم ہوتے ہیں۔ وقت پر بچوں کی ضروریات پوری ہوں یا نہ ہوں ٹی وی سیریلس کے اوقات میں فرق نہیں آنا چاہئے۔ چند سال قبل یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی کہ ایک ماں نے (اگرچہ غیر مسلم تھی) بچے کے رونے کی وجہ سے ٹی وی پروگرام میں خلل واقع ہونے پر اس نے بچے کا منھ سیریل ختم ہونے تک دبائے رکھا بعد میں دیکھا تو بچہ سانس رک جانے کی وجہ سے فوت ہوچکا تھا۔ (العیاذ باللہ) آج مسلم معاشرہ میں ٹی وی کی لعنت اتنی عام ہوگئی ہے کہ اس سے جہاں بچوں کی نگہداشت کا مسئلہ بگڑتا جارہا ہے وہیں بے دینی و بے حیائی بھی پروان چڑھ رہی ہے۔

غور کریں کہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے کس تڑپ اور بے چینی کے ساتھ اپنے لخت جگر کی راحت رسانی کا خیال فرمایا اور بذات خود ان کی تربیت و پرورش فرمائی۔ آپ کے اس عملی گوشے سے ان ماؤں کو سبق لینا چاہئے جو اولاد کی پرورش کو یا تو مطلقاً اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتیں یا پھر اس میں سستی سے کام لیتی ہیں۔ خدارا اس غفلت کو دور کریں اور ان کی تربیت و نگہداشت کا بہتر سے بہتر خیال رکھیں۔

حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کا عمومی پہلو حیا و پاکدامنی ہے۔ یہ گوشہ خواتین کے کسی ایک طبقے کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام کے لئے عام ہے اور موجودہ پرفتن دور میں اس سبق آموز پہلو کو اختیار کرنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ وہ خواتین جو ملازم پیشہ ہیں یا کسی ضرورت کی وجہ سے گھر سے باہر سکونت پذیر ہیں یا تعلیم و تعلم کے لئے گھروں سے باہر نکلتی ہیں، ان تمام کو بذات خود اپنی عزت و عظمت کی حفاظت کرنی ضروری ہے بلکہ فرض ہے، اسی طرح وہ خواتین جن کے شوہر اپنی کسی دنیوی غرض کی وجہ سے باہر قیام پذیر ہیں، انہیں بالخصوص اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ ان کی ناموس پر کوئی داغ نہ لگ جائے اور بشری تقاضے کی وجہ سے ان کے قدم بہک نہ جائیں۔ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو نیک و صالح بیوی قرار دیا ہے جو شوہر کی غیر موجودگی میں ان کی امانت میں خیانت نہ کرے۔ (مشکوٰۃ : 283) اس سے معلوم ہوا کہ شریعت خواتین کو مذکورہ چیزوں (یعنی تعلم و تعلیم، ملازمت یا کسی دوسری ضرورت کی بناء پر باہر جانے) کی اجازت دیتی ہے بشرطیکہ حیاء و پاکدامنی کی حفاظت مقدم رہے کیونکہ اس پرفتن اور پراگندہ ماحول میں عورت کے لئے اپنی عزت و عصمت کی حفاظت ایک ناگزیر مسئلہ ہے۔ جگہ جگہ جنسی ہوس کی آگ کو ٹھنڈا کرنے والے بھیڑیے تنہا خواتین کا استحصال کر رہے ہیں، آج تجارت گاہیں، آفیسر حتیٰ کہ تعلیم گاہیں بھی اس مرض سے پاک نہیں ہیں، اس تناظر میں حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی زندگی خواتین کے لئے ایک بہترین اسوہ ہے کہ جس طرح انہوں نے تنہا رہ کر مکمل پاکدامنی کے ساتھ اپنی زندگی گزاری ہے اسی طرح خواتین بھی ان کے نقش قدم پر چل کر اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کے یہ چند رہنمایانہ خطوط ہیں اگر ان سبق آموز پہلوؤں کو خواتین اپنی زندگی کا حصہ بنالیں تو معاشرے سے کئی برائیوں کا خاتمہ ممکن ہے اور ہر خاتون اپنے خاندان کی مثالی خاتون بن سکتی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کے انمٹ نقوش کو امت کی خواتین کے لئے مشعل راہ بنائے۔ (آمین)

□□□

رضوان کے سالانہ خریداروں سے گزارش

یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ ماہنامہ رضوان کی اشاعت خالص تبلیغی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ کوئی تجارتی کاروباری مفاد اس اشاعت میں پیش نظر نہیں ہے۔ چنانچہ ۴۰ صفحات کے اس رسالے کی قیمت انتہائی کم (فی شمارہ صرف تیس روپے اور سالانہ خریداری -/300 روپے) ہے۔ ہمارے پیش نظر نفع بخش کاروبار نہیں بلکہ ہم اپنے وسائل میں رہتے ہوئے رضوان کے ذریعے بیش بہا مضامین شائع کرتے ہیں۔ اس ضمن میں رضوان کے سالانہ خریدار بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اگر تمام سالانہ خریدار اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے بروقت اپنی سالانہ رقوم ''ادارہ رضوان'' کو بھیج دیں تو وہ بھی ہماری ان تبلیغی کوششوں میں معاون ہوں گے۔

سالانہ خریداروں سے گزارش ہے کہ مدت خریداری ختم ہونے پر زر سالانہ کی ترسیل میں جلدی فرمائیں۔ ہر ماہ سرخ نشان کے ذریعہ ان کو اطلاع دی جاتی ہے۔ اور منی آڈر فارم بھی روانہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ یاددہانی ہو سکے۔

یاد رکھئے! زر سالانہ کی بروقت عدم وصولی سے ادارے پر مالی بوجھ بڑھتا ہے اور پچھلے کچھ عرصے سے اس میں اضافہ ہی ہوا ہے لہٰذا سالانہ خریداروں سے گزارش ہے کہ رضوان کی مدت خریداری ختم ہوتے ہی زر سالانہ کی ادائیگی کریں تاکہ ادارے پر مالی بوجھ نہ پڑے بصورت دیگر اگر آئندہ ''رضوان'' خریدنا نہیں چاہتے، تب بھی خط لکھ کر یا بذریعہ فون اس بارے میں دفتر رضوان کو مطلع فرمادیں۔ نیز اپنا خریداری نمبر یا جس نام سے رسالہ جاری ہے وہ پتہ صاف اور خوشخط ضرور لکھیں۔ آپ کا تعاون اس دینی سعی و کاوش میں ہمارے لئے نہایت اہم اور ''رضوان'' کے معیار میں اضافے کے ساتھ آپ کیلئے کار خیر کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

قارئین رضوان سے گذارش ہے وہ اپنا سالانہ چندہ مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں جمع کر سکتے ہیں۔

Bombay Mercantile Co-operative Bank, Lucknow-18

Name of Account "RIZWAN MONTHLY", Account No. : 205110100005299

IFSC Code : UTIBOSBMCBI

نوٹ: رقم ڈالنے کے بعد دفتر کو مطلع ضرور کریں ورنہ رقم آپ کے کھاتہ میں منتقل نہ ہوگی۔ اس نمبر پر مطلع کریں Cantt. No. : 9415911511

مفتی مجیب الرحمان

متکبر کون ہے؟ انجام کیا ہے؟

انسان کے اخلاقی، روحانی اور مہلک نفسانی عوارض میں سے ایک عُجب (Arrogance) تکبر اور استکبار ہے۔ اسی قبیح خصلت نے شیطان کو ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ کیا۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا: آدم کو سجدہ کرو، تو ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا، اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافر ہوگیا۔(البقرۃ:44)

''عُجب کے معنی ہیں: ''غرور میں مبتلا ہونا'' اور ''تکبر واستکبار'' کے معنی ہیں: ''خود کو بڑا گردانا یا بڑا سمجھنا۔'' ''المتکبر'' اللہ تعالیٰ کی صفت جلیلہ ہے، حقیقی کبریائی اور بڑائی صرف اسی کی شان ہے، اسی لئے سورۃ الحشر آیت:23 میں جہاں اللہ تعالیٰ کی ایک سے زائد صفاتِ جلیلہ کو ایک مقام پر بیان فرمایا ہے، ان میں ''المتکبر'' کی صفت بھی ہے، اس کے معنی ہیں: ''بڑائی والا، عظمت والا''۔

بقول علامہ اقبال:

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری

حدیث قدسی میں رب ذوالجلال فرماتا ہے: ''کبریائی میری'' ''رداء'' اور عظمت میری ''اِزار'' ہے، سو (بندوں میں سے) جو ان صفات میں مجھے چیلنج کرے گا، تو میں اسے جہنم میں داخل کردوں گا اور ایک روایت میں ہے: جہنم میں پھینک دوں گا۔'' (سنن ابن ماجہ: 4175)۔ جب ''رداء'' اور ''اِزار'' کی نسبت اللہ کی ذات کی طرف کی جائے تو اس کے وہی معنی مراد ہوں گے جو اس کے شایان شان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جسم، جسمانیات، ان کے عوارض، لوازم اور متعلقات سے پاک ہے، مقدس اور معریٰ ہے۔ قرآن و حدیث میں اس طرح کی نسبتیں انسانوں کو سمجھانے کے لئے ارشاد فرمائی گئی ہیں، ان سے ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ ذات اُلوہیت جل و علاء کے شایانِ شان جو بھی معنی مراد ہوں، ان پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہماری مثالی دنیا میں اعلیٰ مناصب کے لئے ایک خاص یونیفارم یا لباس ہوتا ہے۔ حدیث پاک سے مراد یہ ہے کہ ''متکبر'' گویا اللہ تعالیٰ کی شانِ کبریائی کو چیلنج کرتا ہے یا اس جیسا بننے کا دعویٰ کرتا ہے یا اپنے آپ کو ایسا سمجھتا ہے، اسی بناء پر اس کا ٹھکانا جہنم کو قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں میں عجز و نیاز اور تواضع وانکساری کی صفات پسند ہیں، بلکہ عبادت کے معنی ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی تذلل (Submissiveness) کے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''بے شک اللہ تعالیٰ مغرور، متکبر کو پسند نہیں فرماتا۔'' (النساء:36)

''اسی طرح اللہ ہر جبار متکبر کے دل پر اس کی سرکشی کے (وبال کے طور) مہر لگا دیتا ہے۔'' (المومن:35)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن متکبرین کو (انسانی شکل میں) چھوٹی چھوٹی چونٹیاں بنا کر اٹھایا جائے گا، لوگ انہیں روندیں گے، ہر چھوٹی چیز بھی ان پر مسلط ہوگی، پھر انہیں جہنم کے اُس قید خانے کی طرف لے جایا جائے گا، جسے ''بُولَس'' کہتے ہیں اور ایسی آگ کے شعلے ان پر بلند ہوں گے، جو آگ کو بھی جلا ڈالے، انہیں زہریلی مٹی اور جہنمیوں کے زخموں کی پیپ پلائی جائے گی۔ (ترمذی:2492)

اس کے برعکس جو اللہ کے حضور تواضع کرے، اللہ تعالیٰ اسے سربلندی عطا فرماتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے ایک درجہ تواضع کرتا ہے، اللہ اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے اور جو شخص اللہ کے سامنے ایک درجہ تکبر کرتا ہے، اللہ اس کو ایک درجہ

پست کردیتا ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو سب سے نچلے طبقہ میں کردیتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ:4176) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بدترین بندہ وہ ہے جو تکبر کرے اور حد سے تجاوز کرے اور ''جبار اعلیٰ'' کی ہستی کو بھول جائے، جو گھمنڈ میں مبتلا ہو اور اترائے اور خداوند کبیر و متعال کو بھول جائے اور جو (احکام خداوندی سے) غافل ہوجائے اور انہیں نظرانداز کردے اور قبر اور اس میں گلنے سڑنے کو بھول جائے جو سرکشی اختیار کرے اور (احکام الٰہی سے) بغاوت کرے اور اپنے آغاز و انجام کو بھول جائے۔'' (ترمذی:2448)

عبداللہ بن مبارک نے کہا: ''کمال تواضع یہ ہے کہ انسان دنیاوی اعتبار سے اپنے سے کمتر کے ساتھ تواضع کرے، یہاں تک کہ اسے احساس ہوجائے کہ دنیاوی جاہ و منصب کی بناء پر آپ کو اس پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے اور یہ کہ جو دنیاوی اعتبار سے اس سے برتر ہے، اپنے آپ کو اس کے آگے ذلیل نہ کرے تاکہ اسے معلوم ہوجائے کہ اس کی دنیاوی برتری حقیقت میں فضل و کمال نہیں ہے۔'' قتادہ نے کہا: ''جسے اللہ تعالیٰ نے مال یا جمال یا علم یا اسباب ظاہری سے نوازا ہو اور پھر وہ تواضع نہ کرے تو قیامت کے دن یہی نعمتیں اس کے لئے وبال بنیں گی۔'' ایک روایت میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ جب میں آپ کو نعمتوں سے نوازوں تو آپ عاجزی اختیار کریں تاکہ میں تکمیل نعمت کروں۔ (احیاء علوم الدین، جلد:3، ص:419)

متکبر کی ایک پہچان اَڑیل پن، ہٹ دھرمی اور کٹ حجتی ہوتی ہے، وہ حق کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا بلکہ عقلی دلائل سے اسے رد کرتا ہے، حالانکہ ایمان کی حقیقت اور مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے آگے بلاچوں و چرا سر تسلیم خم کردیتا ہے۔ اسے عقل کی کسوٹی پر نہیں پرکھتا بلکہ عقل کی راستی اور اصابت (Righteousness) کے لئے وحی ربانی کو کسوٹی بناتا ہے اور اسی نتیجہ کو راست اور حق سمجھتا ہے، جو وحی کی کسوٹی پر پورا اترے، جو عقل کو مطلقاً معرفت حق کے لئے میزان اور کسوٹی بنائے، وہ زندیق ہے اور یہی ابلیس کا شعار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور (اے آدم) ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا (اور) وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، (اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تجھ کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا، جب کہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا؟ اُس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے، (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: تو یہاں سے اتر، تجھے یہاں گھمنڈ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔''

(الاعراف:13-12)

یعنی آگ لطیف ہے اور مٹی کثیف اور لطیف چیز کثیف سے افضل ہے تو میں اپنے جوہر تخلیق کے اعتبار سے افضل ہو کر اَدنیٰ کے سامنے سجدہ کیسے کروں؟ اسے عقل نہیں مانتی، دلیل اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ سو اُس نے عقلی دلیل سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو رد کردیا اور راندۂ درگاہ ہوا اور فرشتوں نے بلاچوں و چرا اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کیا اور آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔ فرشتوں کو معلوم تھا کہ کمال نہ آگ میں ہے، نہ ذرۂ خاک میں ہے، کمال تو رب ذوالجلال کی عطا میں ہے، وہ چاہے تو ذرّے کو آفتاب سے بالا کردے، قطرے کو سمندر کردے اور خاک کے پتلے آدم کو رشک ملائک بنادے۔

پس متکبر کی ایک پہچان خودسری، خود فریبی اور اپنی ذات کو راستیِ فکر (Self righteousness) کا حامل سمجھتا ہے، ایسے شخص پر اللہ تعالیٰ معرفت حق کے دروازے بند کردیتا ہے اور فریب نفس میں مبتلا ہو کر وہ اپنی خطا کو صواب، باطل کو حق، ظلم کو عدل اور ناروا کو روا سمجھنے لگتا ہے۔ آج ہم اپنے پورے ماحول اور نظام کا جائزہ لیں تو ہم پر عیاں ہوگا کہ بحیثیت مجموعی ہم اسی مرض میں مبتلا ہیں یہ فریب نفس انفرادی بھی ہوتا ہے اور گروہی اور طبقاتی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم میں کتنے ہی گروہ ہیں جنہوں نے شریعت کے مسلمہ معیارات کو رد کرکے اپنے معیارات وضع کرلئے ہیں۔ (باقی.....صفحہ.....13.....پر)

مفتی تبریز عالم جلیمی قاسمی

سکھ مت: ایک تعارف

مذہب کی تحقیق:

دنیا میں جہاں کہیں انسانی آبادی ہے اس کا اپنا ایک طرز معاشرت ہے جسے وہ شدت سے اختیار کئے ہوئے ہے، یہی وہ مفہوم ہے جو از روئے لغت ''مذہب'' میں شامل ہے۔ مذہب اسم ظرف کا صیغہ ہے جو مصدر میمی کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی ہیں چلنے کی جگہ، چلنے کا راستہ وغیرہ اور جن اصولوں اور قوانین پر زندگی گزاری جاسکے۔ یہ مفہوم اس کی اصطلاحی حقیقت ہے۔ اسی سے ملتا جلتا ایک لفظ (دین) بکثرت استعمال ہوتا ہے جسے مذہب کا مترادف بھی قرار دیا جاتا ہے: چنانچہ قرآن میں ہے: **ان الدین عنداللہ الاسلام۔** (آل عمران:91)

یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دین اور مذہب میں ایک بڑا باریک فرق یہ ہے کہ دین نام ہے ان اصول وضوابط کا جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام کے درمیان مشترک رہے، جب کہ ''مذہب'' انہی اصول کی فروع کا نام ہے: اس سے معلوم ہوا کہ دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، البتہ مذاہب تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ مذہب کے اس تناظر میں ہمیں بعض ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جن کا کوئی نظریہ اور مذہب نہیں ہے، انہیں ''دہریہ'' کہا جاتا ہے، لیکن دہریہ کی یہ تعریف ''جو خدا اور پیغمبر خدا کا منکر ہو'' زیادہ جامع ہے۔

مذاہب کی دو قسمیں ہیں: مذاہب عالم کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، الہامی۔ غیر الہامی۔

الہامی سے مراد وہ ادیان ہیں جو خدا اور اس کے رسولوں اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کی طرف منسوب ہوں اور غیر الہامی مذاہب وہ ہیں جن کے ماننے والے خود کو اللہ تعالیٰ کی متعین کردہ تعلیمات اور عقائد کے تابع نہیں سمجھتے، الہامی مذاہب میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام سرفہرست ہیں جب کہ غیر الہامی مذاہب میں بقیہ مذاہب آتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ابتدائے آفرینش سے انسان کا اصلی مذہب توحید رہا ہے، شرک اس وقت پیدا ہوا جب انسانی آبادی میں اضافہ اور پھیلاؤ اور انبیاء کی تعلیمات دھندلی پڑ گئیں، چنانچہ آج بھی غیر الہامی اور شرک پر مبنی مذاہب: ہندومت، جین مت، بدھ مت، اور سکھ مت وغیرہ میں الہامی تعلیمات کی ہلکی پھلکی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ سکھ مت بھی غیر الہامی مذاہب کا حصہ ہے، ذیل میں کچھ ضروری اور معلوماتی باتیں درج کی جاتی ہیں۔

سکھ مت کی حقیقت:

سکھ مت کے بارے میں آج کل دو نظریے پائے جاتے ہیں، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ایک جدید اور خود مختار مذہب ہے، جب کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ کوئی باقاعدہ مذہب نہیں ہے، بلکہ یہ ہندومت کی ایک اصلاحی تحریک کا نام ہے جس نے ہندوانہ عقائد اور نظریات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس کا نصب العین ہندوؤں کے مذہبی عقائد کی تطہیر تھا۔

(تاریخ دعوت وعزیمت: 5/285، تقابل ادیان، ص:105)

سکھ مذہب کے بانی:

سکھ مت کے حقیقی بانی کا نام ''بابا گرونانک'' ہے۔ آپ 1469ء میں لاہور سے قریب پچاس میل جنوب مغرب میں ایک گاؤں ''تل ونڈی'' میں پیدا ہوئے تھے، یہ گاؤں اب ننکانہ کے نام سے مشہور

ہے، جائے پیدائش سے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ گرو جی اپنے ننہال میں پیدا ہوئے تھے، اسی نسبت سے ان کا نام ''نانک'' تجویز ہوا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بچہ جو اپنے ننہال میں پیدا ہوا ہے۔ آپ کے والد کا نام بابا کلیان سنگھ تھا مگر وہ کالو کے نام سے زیادہ مشہور تھے، آپ کے والدین مذہبی طور پر ہندو تھے، گرونانک جی کو مذہب اور شعر و شاعری سے بہت لگاؤ تھا، کاروباری اور عملی زندگی سے گھبراتے تھے۔ مجبور ہوکر والدین نے بارہ سال کی عمر میں شادی کردی جس سے ان کے یہاں دو بیٹے پیدا ہوئے، جب اولاد کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر پڑی تو انہیں روزگار کی فکر ہوئی اور اپنے والدین کی کوششوں سے سلطان پور کے نواب دولت علی خاں لودھی کے یہاں ''گھریلو ساز و سامان کے محافظ مقرر ہوئے اور ایک طویل عرصہ وہاں کام کیا، تاہم اس دوران انہیں جب بھی فرصت ملتی تو اپنے دل کو تسکین دینے کیلئے جنگلات میں جاکر مراقبہ میں مشغول ہوجاتے۔ (تقابل ادیان، ص: 106، گرونانک جی اور اسلام، ص: 12)

سکھ مذہب کی شروعات:

کہا جاتا ہے کہ 1499ء میں ایک روز نانک جی اپنے دوست ''مردانہ'' کے ساتھ ندی میں نہانے کے لئے اترے تو غوطہ لگانے کے بعد باہر نہیں نکلے تلاش بسیار کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا، تین دنوں کے بعد اسی جگہ سے ظاہر ہوئے جہاں دریا میں اترے تھے۔ لیکن کچھ دن بالکل خاموش رہے اور جب زبان کھولی تو یہ کہا: ایک اونکا ست نام، کرتا پرکھ، ترھو، نرویر (یعنی خدائے واحد ہی سچ ہے، وہی خالق ہے، اسے کسی کا ڈر نہیں، اس کی کسی سے دشمنی نہیں) جب ان جملوں کا مطلب پوچھا گیا تو کہا: نہ کوئی ہندو ہے، نہ کوئی مسلمان۔ دریا میں غائب ہونے کے بارے میں بتایا کہ مجھے خدا کی بارگاہ میں لے جایا گیا تھا، وہاں مجھے امرت کا پیالہ دیا گیا اور حکم ہوا کہ نام خدا کی عقیدت کا پیالہ ہے اسے پی لو اور میرے نام کی خوشی مناؤ اور دوسروں کو اس کی تبلیغ کرو، اس واقعہ کے بعد نانک جی کو ''گرو'' بمعنی استاذ کہا جانے لگا۔ (ہندوستانی مذاہب ایک مطالعہ، ص: 61)

اور بعض محققین نے لکھا ہے کہ جب بابا نانک کی عمر تیس سال کے قریب پہنچی تو سکھوں کی روایات کے مطابق انہیں اللہ کا دیدار نصیب ہوا اور انہیں پیغمبر کے طور پر منتخب کرلیا گیا اور انہیں ''کوئی مسلمان ہے نہ کوئی ہندو'' کا پیغام دیا گیا، اس کے بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ اس کے بعد بابا نانک نے اسلام اور ہندومت کے درمیان اتحاد کی تبلیغ کرتے ہوئے مستقل اسفار شروع کئے اور اپنے ساتھی مردانہ کے ساتھ اس نئی تعلیم کے مبلغ بن گئے، اپنی تعلیم پر زور دینے کے لئے نانک جی نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی پوشاک پہنی اور اپنے عقائد کے پرچار میں لگ گئے اور اس طرح سے سکھ مذہب کا آغاز ہوا، نانک کے ابتدائی دور میں ان کے پیروکار کو بھائی کہا جاتا تھا جو غالباً پانچویں گرو کے دور میں ''سکھ'' کے نام سے متعارف ہوئے، سکھ پنجابی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مقلد ہیں۔ (مذاہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا: 253)

سکھ مت کا تاریخی ارتقاء:

گرونانک 1539ء کو کرتارپور پاکستان میں فوت ہوئے، اب وہاں ایک گردوارہ بنا ہوا ہے، یہ بات سکھوں کے یہاں مشہور ہے کہ بابا گرونانک کی لاش چادر کے نیچے سے غائب ہوچکی تھی اور اس جگہ مقامی لوگوں کو پھول پڑے ہوئے ملے تھے، اس لئے نہ ان کو جلایا جاسکا اور نہ ہی دفن کیا جاسکا۔ نانک جی کی وفات کے بعد اس تحریک کی قیادت انگد نامی شخص نے سنبھالی، جس نے سکھوں کا اپنا رسم الخط ''گورمکھی'' ایجاد کیا اور سکھ کی مذہبی تحریروں کو مرتب کیا، اس کے بعد کے گروؤں نے بھی نانک کے تعلیمات کی پیروی کی۔ اس کے علاوہ تیسرے گرو امرداس نے سکھوں کو بائیس حلقوں میں تقسیم کیا اور چوتھے گرو رام داس نے سکھوں کی شادی اور مرنے کی رسومات ہندو مذہب سے الگ متعین کیں اور ایک قدرتی چشمہ اکبر بادشاہ سے حاصل کرکے ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اس چشمہ کو بڑے تالاب کی شکل میں تبدیل کرادیا، بعد میں یہ

تالاب امرتسر (چشمہ آب حیات) کے نام سے مشہور ہوا اور شہر کا بھی یہی نام پڑ گیا۔

پانچویں گرو ارجن دیو سنگھ (1563-1606ء) کے آنے پر گرو کے عہدے اور مذہب میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں، اس نے سکھ مت کی مقدس کتاب گروگرنتھ صاحب تیار کی، اسی کے دور میں سکھوں میں امن پسندی کے بجائے جارحیت کا رجحان پیدا ہوا، جس کے نتیجہ میں جہانگیر بادشاہ سے ٹکراؤ ہوا اور جہانگیر کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا، اس کے بعد اس کا بیٹا گوبند (1596-1645ء) چھٹا گرو منتخب ہوا جس نے حفاظتی پہرے کے لئے خود کو مسلح کیا جس کی وجہ سے سکھوں میں دشمنوں کے لئے انتقامی جذبات میں اور اضافہ ہوا۔ نویں گرو تیغ بہادر تھے، اورنگ زیبؒ نے جب اس پر اسلام پیش کیا اور اس نے انکار کر دیا تو اورنگ زیبؒ نے اس کو قتل کرا دیا، جس کے بعد اس کا بیٹا گروگوبند سنگھ (1666-1708ء) آخری گرو کے طور پر منتخب ہوا، چونکہ اس کے باپ کو قتل کیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ اور اس کے ماننے والے مغل حکومت کے سخت مخالف ہو گئے اور اس نے سکھوں کو جنگ کے لئے زیادہ منظم کیا، جس کے لئے اس نے سخت ترین امتحان کے بعد سب سے پہلے پانچ سکھوں کو جو مختلف ذاتوں کے تھے ایک مخصوص رسم کے ذریعہ مریدین کے حلقہ میں داخل کیا جو خالصہ کہلائے، اس کے بعد ہزاروں سکھ اس میں داخل ہوئے، گروگوبند نے اس کے لئے کچھ مخصوص قوانین بھی بنائے اور مردوں کے لئے اپنے نام میں سنگھ (شیر) اور عورتوں کو اپنے نام میں کور (شہزادی) کا استعمال اور پانچ چیزوں کا جو "ک" سے شروع ہوتی ہیں رکھنا ضروری قرار دیا یعنی "کیس" (بال) کنگھا، کڑا، کچھ (جھانگیہ) اور کرپان (تلوار)۔ خالصہ کی تشکیل کے بعد ہی گروگوبند سنگھ نے مغل سلطنت سے لڑنے کے لئے فوجی کارروائیاں شروع کر دیں، گروگوبند نے اپنی موت سے پہلے یہ طے کر دیا تھا کہ اب آئندہ کوئی آدمی سکھوں کا گرو منتخب نہیں ہوگا، بلکہ ان کی کتاب گرنتھ صاحب ہی ان کے لئے ہمیشہ گرو کا کام دے گی، اس لئے اب گرو کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ (ہندوستانی مذاہب، ص:66، مذاہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا، ص:257)

جدید سکھ مت:

اگرچہ دنیا کے اکثر حصوں میں سکھ برادریاں موجود ہیں، البتہ جدید سکھ زیادہ تر ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، اب سکھوں کے مختلف فرقے ہیں، چونکہ اس مذہب کے اوّلین بانیوں کی تعلیم میں "عدم تشدد اور امن پسندی" کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، اس کی وجہ سے موجودہ سکھ برادری میں زیادہ تر لوگ سادگی کی طرف مائل ہیں۔ کچھ مشہور فرقوں کے نام یہ ہیں:

(1) نانک پنتھی (یہ لوگ امن پسند ہوتے ہیں اور لمبے بال رکھنے پر اصرار نہیں کرتے اور ڈاڑھی منڈوانے کو ترجیح دیتے ہیں)۔

(2) اداسی (یہ لوگ رہبانیت پسند ہوتے ہیں، اداسی کے معنی ہیں: تارک دنیا)

(3) اکالی فرقہ (اکالی کے معنی ہیں "اللہ" یعنی خدا کی پوجا کرنے والا فرقہ، یہ لوگ انتہائی جنگجو ہوتے ہیں)

(4) سنگھ (اس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے)

نوٹ: اب عام طور سے سکھ وہ ہیں جو اپنے کو دس گروؤں کے شاگرد مانتے ہیں اور ان کے ملفوظات اور تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں۔

سکھوں کے گردوارے:

سکھوں کے گرودوارے پنجاب کے اکثر علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں زیادہ مشہور گرودوارے: امرتسر، گورداس پور اور فیروز پور کے اضلاع میں ہیں، سکھوں کے نزدیک سب سے زیادہ مقدس گرودوارہ امرتسر کا طلائی مندر یعنی دربار صاحب ہے اور گرونانک کی جائے پیدائش ننکانہ صاحب ہے، جہاں ہر سال مقررہ اوقات پر میلے لگتے ہیں، ہر سکھ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کم از کم ایک مرتبہ وہ امرتسر کے گردوارے میں حاضر ہو جائے، آج کل اسے گولڈن ٹیمپل کہا جاتا ہے۔

(تقابل ادیان، ص:13)

سکھوں کی مذہبی کتاب :

سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ ہے جسے سکھوں کے پانچویں گرو ارجن سنگھ نے لکھا تھا، گرنتھ کے کل اشعار کی تعداد 3384 ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب حضرت ابراہیم فرید چشتی کی شاعری سے لبریز ہے اور بعض کا خیال ہے کہ حضرت بابا فرید گنج کا کلام ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے ہر شعر کے اخیر میں ''فرید'' تخلص موجود ہے۔

سکھ مت کی تعلیمات:

سکھ مت کی تعلیمات میں جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ ''اخوت اور مساوات کا پرچار'' ہے، چنانچہ گرونانک نے یہی نعرہ دیا تھا کہ ''کوئی مسلم ہے نہ کوئی ہندو ہے۔'' سکھ مذہب کا رجحان اس جانب بھی ہے کہ ہندومت اور اسلام دونوں افراط اور تفریط کا شکار ہیں، گرونانک کی تعلیمات میں توحید، عشق الٰہی، تزکیہ نفس، خدمت خلق، ارکان اسلام، رسالت، قرآن کریم اور قیامت اور اسلامی تصورات کے ساتھ ساتھ آواگون اور گرو جیسے ہندوانہ تصورات بھی پائے جاتے ہیں، چونکہ گرونانک کی تعلیمات میں اسلام کے عقائد و احکام کا تصور بھی ہے جس کی بناء پر بعض لوگ انہیں مسلمان مانتے تھے، اور ہندوانہ تصور کی وجہ سے انہیں ہندو بھی کہا جاتا ہے۔

کیا سکھوں کو مسلمان مانا جاسکتا ہے؟

موجودہ سکھ مت اور اسلام کا تقابل کیا جائے تو یہ حقیقت خوب واضح ہوجاتی ہے کہ سکھ مسلمان نہیں ہیں، اور خود بھی اپنے کو مسلمان نہیں سمجھتے اور نہ ان کے نام مسلمانوں جیسے ہوتے ہیں، شواہد کے طور پر چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

1- گرونانک کا اخوت مساوات کا تصور (نہ کوئی مسلم ہے نہ کوئی ہندو ہے) اسلامی نظریہ مساوات سے بالکل الگ ہے، اسلام ایک دین ہے اور کفر خواہ کسی بھی صورت اور شکل میں ہو وہ الگ دین ہے۔ الکفر ملة واحدة، دونوں مساوات کے نام پر جمع نہیں ہوسکتے۔

2- تناسخ اور آواگون کا ہندوانہ عقیدہ سکھ مت نے قبول کیا ہے جب کہ یہ اسلام کے مخالف ہے۔

3- نبوت و پیغمبری : سکھ لوگ اپنے بانی گرونانک کو ایک پیغمبر کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں، جب کہ اسلام میں نبیؐ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوسکتا۔

4- خلاف فطرت امور : سکھ جسم کے کسی حصہ کا بال نہیں کاٹتے ہیں، جب کہ اسلام دین فطرت ہونے کی وجہ سے غیر ضروری بالوں کے تراشنے کا حکم دیتا ہے۔

(تقابل ادیان، ص:114)

سکھوں کے شب و روز:

سکھوں کے شب و روز کے معمولات کچھ اس طرح ہیں کہ صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے غسل کرتے ہیں، پھر مخصوص بھجن گاتے ہیں اور دعائیں پڑھی جاتی ہیں، رات میں بھی اس کا رواج ہے۔ سکھ اجتماعی عبادات کے لئے گردوارے میں جمع ہوتے ہیں جہاں عبادات کا مرکزی عنصر گرنتھ ہوتا ہے، کیونکہ سکھوں کا کوئی مذہبی پیشوا نہیں ہوتا۔ (مذاہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا، ص:259)

اس موضوع پر تفصیلی کتابیں:

1- دین اسلام گرونانک جی کی نظر میں تالیف : عبیداللہ گیلانی، کتب خانہ انجمن ترقی جامع مسجد دہلی۔

2- گرونانک جی اور اسلام، مفتی محمد فاروق صاحب مکتبہ محمودیہ ہاپوڑ روڈ میرٹھ۔

3- ہندوستانی مذاہب ایک مطالعہ، ڈاکٹر رضی احمد کمال، مکتبہ الحسنات دہلی۔

4- تاریخ پنجاب، لالہ کنہیالال جی۔

5- تاریخ دعوت وعزیمت جلد پانچ، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

6- مذاہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا، مصنف: لیورس مور، ترجمہ سعدیہ جواد، یاسر جواد، نگارشات پبلیشرز لاہور۔

7- تقابل ادیان، مولانا پروفیسر محمد یوسف خان، بیت الاسلام انارکلی لاہور۔

8- سکھ مت، آزاد دائرۃ المعارف، ویکی پیڈیا۔

○○○

عاصمہ شفیع

کالج یونیورسٹی طالبات کو بھٹکنے سے کیسے بچائیں

اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سے حضرت انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا۔ انسان کو عقل سلیم سے نوازنے کے بعد اس کے سینے کے اندر ''دل'' نام کی ایک ایسی چیز عطا کی جس کے دھڑکنے سے نہ صرف وہ زندہ جاوید ہستی کی صورت میں کارحیات انجام دیتا پھرتا ہے بلکہ اس دل کو جذبات سے مزین کرکے ایک انسان کو دوسرے انسان کے لئے کارآمد بنانے کے ساتھ ساتھ اُن کے درمیان آپسی تعلقات کی راہیں بھی پیدا کی ہیں۔ یہ انسانی شعور اور جذبات ہی ہیں جو اُسے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے، ایک دوسرے کے کام آنے نیز ایک دوسرے سے وابستہ ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اگر فہم و شعور اور قلبی جذبات مٹی کے اس مجسمے کے اندر نہ ہوتے تو انسانوں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں رہتا، پھر انسان اشرف المخلوقات نہیں کہلاتا۔

رب کائنات کی حکمت کا یہ حسین پہلو ہے کہ اس نے انسانوں میں بھی افزائش نسل کی خاطر مرد اور عورت کو اپنے فطری طور پر مرد کے مقابلے میں خاتون کے دل میں رحم کی سطح کچھ زیادہ سی رکھی ہے۔ اُس کے دل میں جذبات، احساسات اور چیزوں کو پرکھنے اور اُن پر فوراً جذباتی ردعمل دکھانے کے لئے مرد کی نسبت کچھ زیادہ ہی لچک پیدا کر رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناانصافیوں، محرومیوں اور زیادتیوں کو سہنے کی طاقت اگرچہ اُس میں زیادہ ہے لیکن ہر ناانصافی اور زیادتی کو دیکھنے کے بعد جذباتی انداز میں ردّعمل دکھانے میں بھی وہ کچھ زیادہ ہی جلد باز ثابت ہوتی ہے۔ بنتِ حوّا کے سینے میں اگرچہ آج یعنی اکیسویں صدی میں بھی وہی دل دھڑکتا ہے جس میں رحم اور الفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن مادیت، خودغرضی، دیکھا دیکھی اور اپنے ہی دھن میں سوار حرص و طمع کے مہیب پردوں نے اُن کے قلب کی اصلیت کو چھپا کر رکھا ہوا ہے، حالانکہ سماجی سطح پر خواتین اپنی رحمدلی اور فطری جذباتیت کو پہچان کر اس صفت کا مثبت استعمال کرتی تو ان گنت مسائل خود بخود حل ہوجاتے۔ سماج میں پچاس فیصد مسائل کا تعلق حوّا کی بیٹی کے اسی دل سے تعلق رکھتے ہیں، وہ اپنی ان ازلی صفات سے گھر، اہل وعیال، والدین، رشتہ داروں اور سماج کے دیگر اہم اور بنیادی کڑیوں کو مضبوطی کے ساتھ نہ صرف جوڑ سکتی ہیں بلکہ اس سب میں محبت اور اخلاص کا رنگ بھر کر سماجی رابطوں کو قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر استوار کرنے میں اپنا داعیانہ کردار بھی ادا کرسکتی ہیں۔

یہاں ان سطور میں، میں جس معاملے میں خواتین بالخصوص طالبات کے کردار کا ذکر کرنا چاہتی ہوں، وہ کتابی کہانیوں سے ماخوذ کوئی افسانوی کردار نہیں ہے بلکہ ہائرسیکنڈری سطح سے لے کر کالج اور پھر یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران میرے عینی مشاہدے کا ایک ایسا سبق ہے جس نے مجھے ہمیشہ بے چینی اور اضطراب میں مبتلا کئے رکھا اور جس پر کافی سوچنے اور غور کرنے کے بعد جو کچھ میں نے اخذ کیا، وہ اپنی عزیز بہنوں کے سامنے اس امید کے ساتھ رکھنے کی جسارت کرتی ہوں کہ اگر کوئی ایک ہی رحمدل بہن میری بات سے متاثر ہوکر عملی طور پر اپنا مثبت کردار ادا کرے تو میں اسے اپنے نامہ اعمال کا روشن ترین پہلو سمجھ لوں گی۔

ہائرسیکنڈری سے لے کر یونیورسٹی تک میں نے اپنے ساتھ اور اپنے آس پاس بہت ساری ایسی قابل، ذہین اور صلاحیتوں سے مالا مال بہنوں کو دیکھا ہے جو غریب گھرانوں

سے تعلق رکھتی ہیں، اُن کی قابلیت، ذہانت، محنت اور لگن پر ہر گوئی داد دیئے بغیر نہیں رہتا لیکن یہی لڑکیاں اکثر و بیشتر اپنے والدین کی پتلی مالی حالت کی وجہ سے نہ صرف ہر وقت احساس کمتری کا شکار رہتی ہیں بلکہ بعض اوقات تعلیم کو ہی خیر باد کہہ کر تمام تر صلاحیتوں کے باوجود ہمت ہار بیٹھتی ہیں۔ اِن معصوم بچیوں کی رحمدلی اُنہیں یہ گوارا ہی نہیں کرنے دیتی کہ وہ اپنے غریب والدین پر بوجھ بن جائیں۔ ایسا بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ سماج میں موجود بیمار ذہنیت اور شیطانی خصائل کے حاملین لوگ ایسی لڑکیوں کی بے بسی اور غربت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی تاک میں لگے رہتے ہیں، اُن کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے، احساس کمتری کی بیماری مستقل طور اُن کی پوری زندگی کو اپنی آغوش میں لیتی ہے اور یوں یہ نہ چاہتے ہوئے بھی گھٹن اور اذیت کے دن گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ غربت اور مجبوری کے مہیب سایے زندگی کے ہر موڑ پر اِن کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، یہ نہ اُنہیں اچھی تعلیم حاصل کرنے دیتے ہیں اور نہ اُن کا اچھی جگہ رشتہ طے ہونے کی کوئی اُمید باقی رہتی ہے۔ ناامید اور مایوسی کو پھر یہ اپنی زندگی میں سانسوں کی طرح شامل کر لیتی ہیں اور یوں ان کی پوری زندگی وبال بن جاتی ہے۔

سماجی سطح پر اُمت کے ذی حس اور باشعور لوگوں کو اس طرح کے مسائل پر اگرچہ توجہ دینے کی بے حد ضرورت ہے تاہم یہاں میں اُن اسکول اور کالج جانے والی ہزاروں لڑکیوں سے مخاطب ہونے کی گستاخی کرنا چاہتی ہوں جو اچھے اور کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ اپنے سینوں میں دھڑکنے والے دلوں کو ٹٹول کر رحمت کی اپنی فطری خصلت کو پہچانیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ امیر اور کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیاں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنی فرینڈ لسٹ میں کم از کم ایک ایک ایسی سہیلی کا ڈھونڈ ڈھونڈ کر انتخاب کریں جو غریب اور مجبور گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، پھر دوران تعلیم اپنے والدین کو اعتماد میں لے یا کم از کم اپنے جیب خرچ میں بچت کر کے وقت وقت پر اُنہیں تحائف کی صورت میں ضرورت کی چیزیں فراہم کریں، اُن کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنا دل کھولیں، اُن کی دیگر ضروریات کو احسن طریقے سے اور نہایت ہی حکمت کے ساتھ پورا کر کے نہ صرف اللہ کی رضا حاصل کر سکتی ہیں بلکہ کسی باصلاحیت لیکن مجبور لڑکی کی مدد کر کے اُن کی زندگی کو بھی صحیح ڈگر پر لگانے میں اپنا رول ادا کریں۔ اس طرح سے جو سکون انہیں حاصل ہوگا، دنیا کی کسی اور چیز میں اُن کے لئے شاید ہی ایسا ممکن ہو سکے۔

آج کے دور میں اُمت کی بیٹیوں کو مختلف ''ازموں'' اور مختلف نعروں کے ذریعے سے لبھانے اور بھٹکانے کی ہزارہا کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہماری تعلیم یافتہ بہنوں تک رسائی حاصل کر کے اُنہیں مساوات مرد و زن کے دروس دیے جاتے ہیں، اُن سے کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مردوں کی ''غلامی'' سے آزاد کر کے اپنی زندگی اپنی مرضی سے جئیں، اُن کے معصوم ذہنوں میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے کہ اسلام اور دینی تعلیمات نے اُن کے گلے میں ''غلامی'' کا ''طوق'' پہنایا ہے لیکن کوئی بھی لبرل اور کوئی بھی نام نہاد فیمنسٹ اُن کے اصل مسائل کی جانب دھیان دینا گوارا نہیں کرتا ہے بلکہ جدید جاہلیت کے یہ نعرے ہی اصل میں بنت حوا کی کسمپرسی کے لئے ذمہ دار ہیں۔ یہ افکار اسلام کی بیٹیوں کو اپنے منصب اور مقام سے گرا کر اُن کے استحصال کے لئے راہیں کھولنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اسلام کی بیٹیوں بالخصوص تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم طالبات کو اپنا مقام پہچان کر نہ صرف اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے کمربستہ ہونا چاہئے بلکہ اُنہیں اپنے سینوں کے اندر دھڑکنے والے دل کی رحمتوں کا فیض بھی اپنے سماج بالخصوص دوسرے طالبات تک پہنچانے کے لئے کام کرنا چاہئے۔ اگر اُمت کی بیٹیاں ایک دوسرے کی مدد کرنے پر ذہنی اور فکری طور پر تیار ہو جائیں گی تو سماج میں نہ بیٹیاں والدین پر بوجھ بن جائیں گی نہ ہی بیٹیاں اعلیٰ تعلیم سے محروم رہیں گی۔ نہ بنت حوا استحصالی عناصر کی بھینٹ چڑھیں گی اور نہ ہی کسی غریب باپ کی بیٹی کے خواب اور ارمان اُدھورے رہ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا مقام پہنچانے کی توفیق عطا کرے۔ آمین

○○○

فقہی مسائل

سوال وجواب

مفتی راشد حسین ندوی

س: کسی شخص نے مسجد کے لئے ایسی جگہ میں زمین وقف کی جو آبادی سے دور ہے، تو کیا اسے بیچ کر دوسری جگہ زمین خریدی جاسکتی ہے، یا اس کی قیمت کسی پرانی مسجد میں صرف کی جاسکتی ہے؟

ج: اگر اس جگہ نہ فی الحال آبادی ہے، نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے تو وقف کرنے والا اگر موجود ہے تو اس جگہ کو بیچ کر دوسری جگہ خرید کر مسجد کے لئے وقف کرسکتا ہے، یا کسی دوسری مسجد میں رقم لگا سکتا ہے، وہ موجود نہ ہو تو مسلمانوں کی جماعت باہمی مشورہ سے یہ کام انجام دے سکتی ہے۔ (ہندیہ: 2/454، کتاب النوازل: 13/130)

س: کسی شخص کے پاس سونا چاندی دونوں ہیں، لیکن سونا نصاب کو نہیں پہنچا ہے اور چاندی پہنچ گئی ہے، بلکہ نصاب سے بھی کافی زیادہ ہے تو زکوٰۃ نکالنے کی کیا صورت ہوگی؟

ج: اس صورت میں سونا اور چاندی دونوں کی قیمت لگوا کر ڈھائی فیصد کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ (شامی: 2/37)

س: لڑکی کس عمر میں شرعاً بالغہ مانی جائے گی؟

ج: اگر لڑکی نو سال کی ہوگئی ہے اور اس میں بلوغ کی کوئی علامت جیسے حیض جاری ہوجانا یا حاملہ ہوجانا پائی جائے تو شرعاً اسے بالغہ مانا جائے گا اور اگر کوئی علامت نہ پائی جائے تو جب مکمل پندرہ سال کی ہوجائے تو شرعاً اسے بالغہ قرار دیا جائے گا۔ (شامی: 5/107)

س: اشراق اور چاشت کا وقت کب سے کب تک رہتا ہے؟

ج: اشراق اور چاشت دونوں کا وقت سورج طلوع ہونے کے بعد جب سورج میں اتنی تیزی آجائے کہ اس پر کچھ دیر نظر جمانا مشکل ہو یعنی طلوع شمس کے پندرہ بیس منٹ بعد شروع ہوتا ہے اور زوال سے پہلے تک رہتا ہے، لیکن اشراق کا شروع میں پڑھنا افضل ہے، جب کہ چاشت کا مستحب اور افضل وقت چوتھائی دن گزرنے کے بعد یعنی نو دس بجے کے قریب ہوتا ہے۔ (شامی: 1/505، احسن الفتاویٰ: 3/467)

س: سینہ پر اُگ آنے والے بالوں کو صاف کرنا شرعاً کیسا ہے؟

ج: سینہ پر اُگنے والے بالوں کو صاف کرنا خلاف ادب ہے، اور نامناسب بھی ہے، اس لئے کہ ایک بار صاف کرنے کے بعد بار بار صاف کرنا پڑے گا اور ان میں سختی بھی آجائے گی۔ لیکن اگر بال بہت زیادہ ہوجائیں جن سے الجھن محسوس ہو تو ان کو صاف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (ہندیہ: 5/358، کتاب النوازل: 15/517)

س: علاج معالجہ کی ضرورت کے لئے عورت سر کے بال مونڈوا سکتی ہے یا نہیں؟

ج: عام حالات میں عورت کے لئے سر کے بال مونڈوانا جائز نہیں ہے لیکن علاج معالجہ کی ضرورت ہو جس کی وجہ سے سر مونڈوانا ضروری ہو، تو سر کے بال مونڈوا سکتی ہے، ترمذی اور نسائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت آئی ہے کہ آپ نے اس سے منع فرمایا کہ عورت سر کے بال مونڈوائے اس ممانعت کا فعل عام حالات ہیں، ورنہ ضرورتاً فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے۔ (ہندیہ: 5/358)

س: کچھ عورتوں کے ہاتھوں پیروں وغیرہ میں کثرت سے بال اگ آتے ہیں، کیا ان بالوں کو شوہر کی خوشنودی کیلئے صاف کیا جاسکتا ہے؟

ج: شوہر کی خوشنودی کیلئے ایسا کرنے کی گنجائش ہے۔ (کتاب النوازل: 15/527-528)

س: مشہور ہے کہ ہومیوپیتھی دواؤں میں الکحل کا استعمال ہوتا ہے اور الکحل شراب کا جوہر ہے تو کیا ہومیوپیتھی دوا کا استعمال کرنا جائز ہے؟

ج: عام طور پر ہومیوپیتھی دواؤں میں جو الکحل استعمال ہوتا ہے وہ انگور اور کھجور سے تیار کردہ نہیں ہوتا بلکہ دیگر اشیاء سے بنا ہوا ہوتا ہے اور اس طرح کا الکحل بطور دوا اتنی مقدار میں استعمال کرنا جائز ہے جس سے نشہ کا خطرہ نہ ہو۔ (تکملہ فتح الملہم: 3/1608، فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: 193)

س: اگر کسی کے دانت پیدائشی طور پر ٹیڑھے ہوں تو ان کو سیدھا کرنے کے لئے تار سے ان کو کسوانا کیسا ہے؟

ج: دانتوں کو سیدھا کرنے کے لئے تار لگانا درست ہے۔ (ہندیہ: 5/336)

آخری صفحہ

مولانا محمد قمر الزماں ندوی
استاد مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاپگڑھ

اس وقت اس فارمولے پر عمل کی ضرورت ہے

دنیا میں ہمت، جرأت، ثابت قدمی اور حوصلہ کی بڑی قدر و قیمت ہے، اس کے بغیر کسی کام، کسی ہدف، کسی مقصد اور کسی تحریک اور مشن میں کامیابی ممکن نہیں، ہر طرح کے معرکے اور زندگی کے تمام امور ہمت، ارادے کی مضبوطی اور حوصلے کے زور پر ہی سر کئے جاتے ہیں، کھیل کا میدان ہو یا جنگ کا سیاست کی زور آزمائی ہو یا کوئی تعلیمی و تعمیری منصوبہ جس طرح ان تمام امور میں کامیابی کے لئے ایک تنظیم اور منصوبہ بندی ضروری ہے اسی طرح کامیابی و کامرانی اور منزل کو پانے کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ اس جماعت اور تنظیم کے افراد کے حوصلے بلند ہوں۔ جس قوم اور جس جماعت میں جتنے زیادہ باہمت اور باحوصلہ افراد ہوں گے وہ قوم اور وہ جماعت کامیابی سے ہمکنار ہوگی اور اپنے ہدف اور منزل کو آسانی سے پالے گی۔ ملے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا سراغ ہندوستان میں جس طرح آج مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں، ماضی میں بھی وہ یہاں کبھی اکثریت میں نہیں رہے ان کی تعداد ہمیشہ یہاں برادران وطن سے ایک چوتھائی ہی رہی یعنی وہ ہمیشہ اقلیت میں ہی رہے لیکن ایک طویل عرصے تک وہ یہاں کے حکمراں رہے، اور تخت حکومت پر فائز رہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تقریباً ہزار سال سے زیادہ یہاں مسلم حکمرانوں اور بادشاہوں نے عدل و انصاف اور رعایا پروری کے ساتھ حکومت کی، ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کو ساتھ لے کر چلے، مذہبی رواداری کا وہ جیتا جاگتا ثبوت دیا کہ تاریخ انسانی نے اس پر فخر کیا اور فخر کرتی رہے گی۔ آخر وہ کیا وجہ اور سبب ہے کہ ماضی میں بھی مسلمان یہاں اقلیت میں رہے لیکن اس کہ باوجود وہ یہاں کے لوگوں کے دل و دماغ اور جسم و جاں پر چھائے رہے، کامیابی کے ساتھ حکمرانی کی اور اپنی حیثیت اور وقار و دبدبہ قائم رکھا اور آج بھی ہم اقلیت میں ہیں لیکن ہم یہاں بے حیثیت بے وقار اور ثانوی درجہ کے شہری بنے ہوئے ہیں اور ہماری یہاں وقعت و عزت پر بالکل داو لگا ہوا ہے اور ہماری حیثیت عرفی بالکل ختم ہونے کے قریب ہے۔ سیاسی پارٹیاں ہمیں پھوٹی کوڑی اہمیت نہیں دے رہی ہیں بلکہ اب تو مسلمانوں کی حمایت کرنے اور ان کی تائید و طرف داری کرنے سے بھی کترا رہی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے ہمت، جرأت اور حوصلہ سے کام لینا چھوڑ دیا جس سے کے معرکے سر کئے جاتے تھے۔ دشواریوں کا مقابلہ کیا جاتا تھا۔ رکاوٹوں کو دور کیا جاتا تھا۔ دوسروں کو مرعوب و مسحور کیا جاتا تھا۔ ماضی میں ہماری تاریخ روشن اور تابناک اور آج (حال میں) ہماری تاریخ تاریک مدھم اور دھندلا ہے۔ ہم اپنی کھوئی ہوئی تاریخ اور کھویا ہوا ماضی کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ اپنا رعب اور وقار اس ملک میں کیسے قائم کر سکتے ہیں؟ اس کے لئے کیا فارمولے ہیں؟ اور کیا حکمت عملی ہوسکتی ہے؟ قرآن مجید مسلمانوں کے لئے آخری کتاب ہدایت ہے یہ وہ الہامی کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی ساری مشکلات

اور پریشانیوں کا حل بھی تجویز کر دیا ہے، اور یہ بتا دیا ہے کہ اگر مخالف گروپ سے، یا کسی دشمن جماعت اور مخالف ٹولی سے تمہارا مقابلہ اور سامنا ہو تو تم اس مشکل گھڑی میں کیا کرو؟ کیا حکمت عملی اختیار کرو؟ قرآن مجید کے سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے ایسی مشکل گھڑی کے لئے اور مد مقابل سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک پانچ نکاتی فارمولا پیش کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یاایھا الذین آمنوا اذا لقیتم فیئة فاثبتوا و اذکروا اللّٰہ کثیرا لعلکم تفلحون و اطیعوا اللّٰہ و رسول ولا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم و اصبروا ان اللّٰہ مع الصابرین۔ اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی صبر سے کام لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مسلمانوں کو دشمن سے مقابلہ کے وقت ایک خاص ہدایت نامہ اور فارمولہ ان آیتوں میں دیا گیا پہلی دو آیتوں میں خاص طور پر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اپنے اندر ثابت قدمی پیدا کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو امید کہ تم مقابلہ میں کامیاب ہو جاؤ گے ثابت قدمی اور ذکر خداوندی یہ وہ نسخہ ہے جو ایمان والوں کے لئے دنیا میں کامیابی اور فتحمندی کا اور آخرت کی نجات و فلاح کا نسخۂ اکسیر ہے اور قرون اولی کی تمام معرکوں میں مسلمانوں کی فوق العادات کامیابیوں اور فتوحات کا راز اسی میں مضمر ہے۔ پہلی چیز ہے ثابت قدمی۔ ثابت قدمی میں ثبات قلب اور ثبات قدم دونوں داخل ہیں کیونکہ جب تک کسی شخص کا دل مضبوط اور ثابت نہ ہو اس کا قدم اور اعضاء ثابت نہیں رہ سکتے۔ اور یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، دنیا کی ہر قوم جانتی ہے اور اس کو اس کا تجربہ ہے کہ مخالف سے مقابلہ کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کامیاب ہتھیار ثبات قلب و قدم ہے دوسرے سارے ہتھیار اس کے بغیر بیکار ہیں۔ دوسری چیز ذکر اللہ ہے یعنی خدا کو یاد کرنا ہے اور کثرت سے یاد کرنا ہے۔ لیکن آج مسلمان مد مقابل سے مقابلہ کے لئے اس روحانی اور معنوی ہتھیار سے بے خبر ہیں ذکر اللہ ثبات قدم کا بہترین نسخہ ہے۔ اللہ کی یاد اور اس پر اعتماد وہ بجلی کی طاقت ہے جو انسان ضعیف کو پہاڑوں سے ٹکرا جانے پر آمادہ کر دیتی ہے اور کیسی مصیبت اور پریشانی ہو اللہ کی یاد سب کو ہوا میں اڑا دیتی ہے اور انسان کے قلب و جگر کو مضبوط اور ثابت قدم رکھتی ہے۔ اس کے بعد تین اور چیزیں ایمان والوں کو بتائی گئیں وہ یہ کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے رہو میدان جنگ میں بھی اس میں کوئی کمی نہ آئے اور یہ یاد رکھو کہ اللہ کی نصرت اور امداد اس کی اطاعت کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہے معصیت اور نافرمانی تو اللہ کی ناراضی اور ہر فضل سے محرومی کے اسباب ہوتے ہیں اور آگے مسلمانوں کو یہ تلقین کی گئی کہ آپس میں مت لڑو خاص طور جنگ کے موقع پر منتشر نہ ہو ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور تم ناکام ہو جاؤ گے اور آخری بات ایمان والوں کو یہ سمجھائی گئی کہ صبر کرتے رہو صبر کا دامن مت چھوڑو کیونکہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یعنی صبر کرنے والوں کو اللہ کی معیت حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ہر وقت ان کا رفیق اور معاون ہوتا ہے۔ یقیناً صبر یہ وہ دولت ہے کہ دونوں جہاں کی دولت اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ آج مسلمانوں کو موجودہ حالات کے تناظر میں اور خاص طور پر جو 2019ء کے معرکہ اور الیکشن کے نتائج کے بعد آئے ہوئے حالات کے پس منظر میں ان قرآنی فارمولے پر عمل کی سخت ضرورت ہے اور امت کو بتانے کی ضرورت ہے کہ تمہاری اس موجودہ مشکل کا حل سورۂ انفال میں بتا دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو ان قرآنی ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور مشکل حالات میں ان ربانی نسخہ پر عمل کی توفیق سے نوازے آمین

○○○